توضیح الاسلامیات

از

محمد عبد الغنی ایم۔ اے

نظر ثانی

سید ساجد حسین ترمذی ایم۔ اے

کتاب مرکز، اردو بازار، لاہور

بار اوّل ———— ۱۹۶۹ء
کتابت ———— جدت برنی
طباعت ———— آفسٹ
ھدیہ ———— چھ روپے

طابع
اکیڈیمک پریس
کیر اسٹریٹ - لاہور

ناشر
سید عابد علی
کتاب مرکز اردو بازار
لاہور

تاریخ اِسلام

زمانہ قبل از اسلام تا خلفائے راشدین تک

یہاں سے کاٹیئے

تاریخ اسلام کا باقی حصہ ماہِ اکتوبر ۱۹۶۹ء

اس چٹ پر مفت دیا جائے گا

"کتاب مرکز" اردو بازار لاہور

(ہم) ایک ہی زمانہ میں مختلف مقامات پر مختلف معاشرے اپنا اپنا مخصوص کلچر رکھتے ہیں اور بعض دفعہ ایک ہی مقام پر مختلف زمانوں میں کلچر مختلف ہو سکتا ہے۔)

کلچر یا ثقافت کی جو خصوصیات اوپر بیان کی گئی ہیں وہ مغربی مُفکرین اور ثقافت و نفسیات کے ماہرین کے قول کے مطابق ہیں، ظاہر ہے کہ جو بات اُن کے ذہن میں آئی انہوں نے مُشاہدہ اور تجربہ کر کے اسے پیش کر دیا، لیکن مغربی مُفکرین کا عام انداز یہ ہے کہ صرف اقوام مغرب کے مخصوص حالات کا بغور جائزہ لیتے ہیں اور پھر اس مخصوص جائزے کو عمومی رنگ دے کر مشرقی اقوام پر چسپاں کر دیتے ہیں حالانکہ بعض حالات میں اُن کے یہ اندازے غلط ہوتے ہیں مثلاً یہی تفصیل جو چار شقوں میں آپ کے سامنے آئی ہے اگر اسے بغور دیکھا جائے اور اسلامی معاشرہ یا تہذیب و تمدّن پر اسے بھی چسپاں کیا جائے تو یہ کسی طرح چسپاں ہی نہیں ہوگا۔ کیونکہ اسلامی معاشرہ یا تہذیب و تمدّن کی بنیاد اللہ کے کلام اور سنّت نبوی پر ہے۔ اور چونکہ قرآن کا چیلنج ہے کہ "لاتبدیل لخلق اللّٰہ" اور پھر کتاب اللہ میں تبدیلی کا ذرا سا بھی احتمال نہیں اس لئے اگر ہم یہ مان لیں کہ اسلامی معاشرہ نے مختلف دوروں یا زمانوں میں اپنے رہن سہن یا تہذیب و تمدّن میں تبدیلیاں کی تھیں تو یہ ایک بہت بڑا بہتان ہوگا، جو ہم اپنے بزرگوں پر لگانے کی جسارت کریں گے۔ اگر کسی وقت عوام الناس نے دوسروں کی تقلید کرتے ہوئے اپنے تمدّن یا تہذیب سے الگ ہو کر نیا طور طریقہ اختیار کر بھی لیا تو اس پر عالمانِ دین نے انہیں تنبیہہ ضرور کی تھی لہٰذا یہ کہنا کہ ہر معاشرہ یا جغرافیائی وحدت میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ کم از کم اسلامی معاشرہ پر کما حقہٗ، چسپاں نہیں ہو سکتا۔

(عربی میں کلچر کے ہم معنی دو الفاظ ہیں تہذیب اور تمدّن تہذیب میں نظریاتی یا علمی پہلو غالب ہے اور تمدّن میں عملی پہلو نمایاں ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تہذیب اصل ہے اور تمدّن و ثقافت اس سے پھوٹنے والی شاخیں جو اگرچہ مختلف سمتوں میں پھیلتی جاتی ہیں لیکن اصل اور جڑ ایک ہونے کی وجہ سے ان میں باہم مماثلت پائی جاتی ہے۔)

موجودہ زمانے میں کلچر ایک وسیع معنوں میں استعمال ہونے والا لفظ بن گیا ہے اس لئے اس کے مماثل اگر کوئی اردو لفظ ہو سکتا ہے تو وہ تہذیب ہی ہو سکتا ہے، اور تہذیب کا اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ کسی قوم کی اجتماعی زندگی کی بنیاد کچھ نظریات یا عقائد پر ہوتی ہے جن کو تسلیم کر لینے سے

اس قوم کے افراد میں ایک خاص قسم کا ذہنی میلان یا رجحان پیدا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے اس سے مخصوص قسم کے اعمال کا ظہور ہوتا ہے۔ ایسے اعمال کا مسلسل ظہور عادت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یعنی وہ اعمال اس سے بغیر کسی رکاوٹ اور ہچکچاہٹ کے عادتاً ظاہر ہونے شروع ہو جاتے ہیں اور یہی عادات مزید پختہ ہو کر سیرت یا کردار بن جاتی ہے۔ اور یہی سیرت یا کردار سے کسی قوم کی خاص تہذیب مراد لی جاتی ہے۔

مثال کے طور پر دنیا کی اقوام میں دو قسم کے نظریے پائے جاتے ہیں (۱) خدا کو ماننا اور ۲۔ خدا کا انکار۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔ ہم نے تمام دنیا کے لوگوں کو پیدا کیا' ان میں مومن بھی ہیں اور کافر بھی' پہلے نظریے کے ماننے والے اپنے تمام اعمال و افعال میں خدا خوفی اور ذمہ داری کا عنصر رکھتے ہیں جب وہ خدا کو اپنا حاکم اعلیٰ تسلیم کر چکے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ وہ جواب دہی کے دن کو یعنی قیامت کے تصور کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھتے ہوں جس دن تمام اعمال کا محاسبہ ہوگا اور اس لئے ان کے تمام افعال میں ایک خاص قسم کا انضباط ذمہ داری اور خوف خدا کی جھلک نظر آتی ہے' وہ عذاب اخروی سے نجات کے طالب ہوتے ہیں وہ خود بھی اپنے پیدا کرنے والے کی مرضی اور اس کے جاری کردہ احکام کی خلاف ورزی سے مجتنب رہتے ہیں اور حتی الامکان اپنے ساتھیوں کو بھی احکام خداوندی کی تابع داری پر کاربند ہونے پر آمادہ کرتے ہیں: وہ حق و صداقت اور عدل و انصاف کے خدائی اصولوں پر خود بھی عمل پیرا ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی آمادہ کرتے ہیں کسی کو دھوکہ نہیں دیتے نہ کسی پر اپنی دھونس جما کر اپنا مطلب نکالتے ہیں کیونکہ ان کو پتہ ہے کہ ان تمام باتوں کا محاسبہ اللہ تعالےٰ کی سرکار میں ایک دن ضرور ہوگا۔ اور وہ ذات علیم و خبیر ہے اس سے کوئی خفیہ یا ظاہر بات چھپی ہوئی نہیں' وہ ہر ناتواں اور کمزور کی اعانت فرض سمجھتے ہیں اور خدا کی مخلوق کی خدمت ان کی زندگی کا مقصد عظیم ہے۔ یہ سب کچھ ان کا طرز عمل اس لئے بنتا ہے کہ وہ خدا کو قادر مطلق علیم و خبیر حاکم اعلیٰ اور مالک یوم الدین' مانتے ہیں اور آہستہ آہستہ یہی ان کی سیرت بن جاتی ہے۔ اور یہی ان کی تہذیب اور یہی ان کا تمدن ہے۔ اس کے برعکس دوسرے نظریے والے یعنی منکرین خدا جب کسی اپنے سے بلند و برتر اعلیٰ و ارفع ذات کا تصور ہی نہیں رکھتے تو خدا خوفی ذمہ داری خدا کی صفات سے متمتع ہونا خدا کی رضا میں؟

کا طالب ہوں۔ خلق خدا کی خدمت ان تمام اعمال سے ان کا دامن خالی ہوتا ہے۔ اگرچہ نام ان کا مسلمانوں کا سا ہی ہو۔ ان کے اعمال میں ہر موقعہ پر خدا سے سرکشی اور بغاوت کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ وہ اپنی ذات میں فرعون و قارون اور عاد و ثمود جیسا کبر و نخوت رکھتے ہیں، دنیا میں جو انسان بستے ہیں اپنے کو وہ ان سے شرف یافتہ اور بڑا خیال کرتے ہیں تکبر اور خود پسندی ان کی سیرت کا جزو اعظم ہوتی ہے۔ اس قسم کی قوموں کے تمام علوم و فنون۔ سیاست و معیشت اخلاق و اعمال سب پر یہی رنگ غالب ہوتا ہے یہی ان قوموں کی تہذیب ہے یہی ان کا کلچر ہے اور اسی قسم کا ذہنی میلان ان کے کردار کا امتیاز ہے۔

مختصر الفاظ میں خدا کو ماننے والے لوگ اپنی زندگی کو بے مصرف اور بے مقصد نہیں سمجھتے، وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا دنیا میں آنا عبث نہیں بلکہ ہم کسی مقصد عظیم کے لئے دنیا میں خدا کی طرف سے بھیجے گئے ہیں۔

یہ لوگ مسلمان کہلاتے ہیں۔ یہ دنیا کے گوشے گوشے میں آباد ہیں، یورپ امریکہ افریقہ ایشیا وغیرہ تمام براعظم ان سے آباد ہیں اور ان کی تعداد دنیا کے تمام مذاہب باطلہ کے ماننے والوں یعنی عیسائی بدھ ہندو وغیرہ اور لامذہب لوگوں کی تعداد سے زیادہ ہے۔
یعنی تعداد کے لحاظ سے باقی کوئی مذہب ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کاش مسلمان کہلانے والے صحیح طرز عمل اور خدا اور رسولؐ کی تابعداری کو اپنا شعار بنائیں۔ اگرچہ جغرافیائی طور پر ایک جگہ کے مسلمانوں کا دوسری جگہ پر آباد مسلمانوں میں اختلاف ہے یعنی لباس خورد و نوش معیشت اور رہن سہن کے طور طریقے ضرور الگ الگ ہیں مثلاً انڈونیشیائی مسلمان مصری مسلمانوں اور یورپی مسلمان چینی مسلمانوں اور پٹھان مسلمان بنگالی مسلمانوں سے طرز معیشت اور رہن سہن میں مختلف ہے، لیکن ان میں وجہ اشتراک اسلام کا مضبوط رشتہ ہے، یعنی اللہ کی ذات کلام الٰہی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یعنی ہادیٔ اعظم تمام مسلمان اقوام کے ایک ہی ہیں اور اس طرح یہ دوسری اقوام سے ممیز و ممتاز ہیں اور کسی قوم کا جغرافیائی اختلاف ان کے اتحاد میں رکاوٹ نہیں بن سکتا یعنی مسلمان خواہ کہیں رہتا ہو اور خواہ کسی ملک سے تعلق رکھتا ہو اور خواہ بظاہر ان میں کتنا ہی بُعد یا اختلاف نظر آئے دوسرے خطے کے مسلمان کا دینی اور

اسلامی بھائی ہے۔ اسی چیز کا نام اسلامی اخوت ہے جو اسلامی ثقافت اور تہذیب کو نمایاں کرتی ہے۔
ہر قوم اپنی تہذیبی اور تمدنی روایات میں اپنے ماضی سے منسلک ہوتی ہے۔ آئندہ آنیوالی نسلیں اپنے پیش رووں سے بہت کچھ ورثے میں لیتی ہیں اور پھر اپنے بعد میں آنیوالوں کو قدرے کانٹ چھانٹ کر اپنی روایات اور مخصوص ثقافتی نظریے دیتی ہیں۔ اس طرح یقیناً کوئی قوم اپنے ماضی سے کٹ کر لیعنی اپنی مخصوص روایت کو ترک کر کے زندہ نہیں رہ سکتی۔

مندرجہ ذیل اصول کسی تمدن کے وجود بقا کے لیے از حد ضروری ہیں۔

۱۔ نیت یا عقیدہ یا نظریہ ۲۔ وابستگی یعنی ان اصول سے دلی لگاؤ
۳۔ ایثار یا قربانی کا جذبہ ۴۔ صلاحیت و طاقت کارکردگی۔

ان چار اصولوں کو ترک کر کے کسی قوم کا تمدن معیشت یا تہذیب زندہ نہیں رہ سکتی انہی کے علاوہ ثقافت یا تہذیب کی گرفت میں تمام قوم کے مختلف طبقات ہوتے ہیں خواہ انفرادی یا اجتماعی رنگ ہو یا جماعتی اور گروہی۔ اگر فرد ثقافت کی تحویل میں ہے تو گویا پوری جماعت اس کی تحویل میں ہے' اگر کسی قوم یا گروہ میں ثقافتی اختلاف موجود ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قوم اپنے تمدن یا تہذیب کے معاملات میں دوسروں پر زیادہ بھروسہ کرتی ہے اور اس میں تقلیدی رجحان زیادہ ہے یاد رہے کہ کورانہ تقلید کسی صورت میں بھی مستحسن نہیں اور غیر اقوام اور خصوصاً کافر اقوام کی تقلید خودکشی کے مترادف ہے۔ قوم میں جب تک ثقافتی ہم آہنگی نہ ہوگی قوم نہیں ہوگی بلکہ ایک جاہل عوام کا گروہ ہوگی۔

اب عوامل اور عناصر کا فرق ملاحظہ ہو۔ عوامل کسی قوم کی ذات میں داخل نہیں ہوتے بلکہ باہر ہوتے ہیں ان کا وجود خارجی حیثیت اور اضافی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس کے وجود یا بقا کا موجب ہوتے ہیں۔ لیکن عناصر اس ترکیب کا نام ہے جو کسی قوم کے اجزائے ترکیبی ہیں اور ان کا وجود خارج میں نہیں بلکہ وجود کے اندر ہے۔ اس کی مثال شربت کی سمجھ لیجئے مثلاً شربت مفرح کے اجزائے ترکیبی یعنی چینی' خوشبو پانی ایسنس کیوڑہ وغیرہ اس کے عناصر ہیں ان کا وجود داخلی نوعیت کا ہے گویا یہ کسی قوم کے قبولیت اور صلاحیت کے مدارج

کا تعین کرنا ہے۔ لیکن شربت جب پکایا جائے گا تو اُس کے لئے آگ ایک خارجی ضرورت ہوگی۔ جس کی مدد سے شربت تیار کیا جائے گا۔ اسی طرح خارجی اثر انداز ہونے والی اشیاء عوامل کہلاتی ہیں اور ان کا وجود کے اندرونی عناصر سے کوئی تعلق نہیں مطلب اس کا یہ ہے۔ کہ اسلامی تہذیب پر باہر سے اثر انداز ہونے والی اشیاء اور ہیں' مثلاً تعلیم و تربیت وغیرہ اور اس کی فطرت کے عناصر ترکیبی میں اس کا ذہن میلان صلاحیت وغیرہ اشیاء شامل ہیں۔ جو کسی خارجی چیز کے رد و قبول کا فیصلہ کرتی ہیں۔

سوالات

۱۔ ثقافت کسے کہتے ہیں۔ اس کی اسلامی مفکرین کیا تعریف کرتے ہیں اور غیر اسلامی علما کیا تعریف کرتے ہیں اور ان کی کیا خصوصیات بیان کرتے ہیں ؟

۲۔ تہذیب سے کیا مُراد ہے۔ تہذیب و تمدن میں کیا فرق ہے' ان کے بقا کے لئے کونسے اُمور ضروری ہیں ؟

۳۔ عوامل و عناصر کے فرق کی وضاحت کیجئے !

باب (۲)

اسلامی تہذیب

اپنی ملت پر قیاس اقوام یورپ کو نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسولؐ ہاشمی

اسلامی تہذیب سے مراد وہ تہذیب ہے جس کی بنیاد ان احساسات اور نظریات پر قائم ہو جو اسلام کے بنیادی اساس و نظریات ہیں ہم خاص تہذیب کے عناصر و عوامل کو گذشتہ باب میں بخوبی واضح کیا گیا ہے اس کی روشنی میں یہ بات ثابت شدہ ہے کہ اسلامی تہذیب کی اساس توحید باری تعالےٰ کے محکم اور پختہ عقیدہ اور نظریے پر قائم ہے۔ توحید خداوندی اصل الاصول ہے۔ جس طرح خداوند تعالےٰ کی ذات اپنی ذاتی اور صفاتی حیثیت میں واحد اور لاشریک ہے۔ یہ اُمتِ مسلمہ بھی اسی طرح ممتاز اور جسم واحد کی طرح متحد مربوط ہے۔
اس تہذیب میں شامل تمام انسان ایک ہی جسدِ واحد کی طرح ہیں ان کی زندگی کا مقصد خدا اور مخلوق میں زیادہ سے زیادہ تعلق کا قیام اور احکام خداوندی کی اطاعت ہے وہ صرف ایک اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور لوگوں کو اسی کے پیغام کی طرف دعوت دیتے ہیں۔
خدا کی ذات کا زیادہ سے زیادہ قرب اور اسی مقصد کے لئے پورا پورا انہماک اور کوشش کرنا یعنی جہاد اس تہذیب کے خاص اصول ہیں۔ اللہ تعالےٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں۔ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ یعنی تم بہترین امت ہو جو عام لوگوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے بنائے گئے ہو، گویا اُمت محمدیہ پر تمام دنیا کی رہنمائی اور قیادت کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ وہ لوگوں کو خدا کی طرف اور ہدایت کی طرف بلاتے ہیں نیکی کا حکم دیتے ہیں

بُری باتوں سے منع کرتے ہیں اور صرف خدا کی عبادت کرتے ہیں اور شرک سے بچتے ہیں۔

جب سے دُنیا بنی ہے دعوت اِلیٰ الحق کا سلسلہ جاری ہوا ہے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جتنے انبیاء دُنیا میں مختلف اقوام کی طرف اور دُنیا کے مختلف ممالک میں تشریف لاتے رہے، چاہے وہ باشرع تھے یا غیر تشریعی، سب پر توحید باری تعالےٰ اور اعمال صالح کی تعلیم نازل ہوئی ہے۔ وہ قرآنِ پاک کی رو سے سب کے سب مسلم تھے اور ان کا دین بھی اسلام تھا۔ اسلام کی تعلیم حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوئی اور آخر میں نبوت کے سلسلہ کی آخری کڑی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوئی آپ قربِ قیامت کے نبیؐ تھے اس کے علاوہ دُنیا کی ہر قوم اور دُنیا کے ہر مُلک کی طرف قیامت تک کے لئے ہادیٔ برحق مبعوث ہوئے۔ آپ پر جو کلام نازل ہوا اُس کی حفاظت کا ذمّہ دار خود خداوند کریم ہے۔ چنانچہ کوئی دشمن سے دشمن بھی قرآنِ پاک میں زیر وزبر یا ایک نقطہ کی کمی بیشی بھی ثابت نہیں کر سکتا۔ یہی دلیل ہے آپ کے ناسخ ادیان ہونے کی اور خاتم النبین ہونے کی۔ کیونکہ گذشتہ کتب سماوی میں اس کثرت سے رَدّ و بدل اور تبدیلی کی گئی کہ ان کی شکل ہی بدل گئی اور اصل اور نقل یا جعلی و اصلی میں امتیاز نہ رہا اس لئے خدا کا آخری پیغام ہدایت قرآنِ کریم کی صورت میں حضورؐ پر نازل ہوا۔

اس سے پہلے جتنے بھی انبیا مبعوث ہوئے سب توحید الہٰی ہی کی تعلیم لیکر تشریف لائے اگرچہ جغرافیائی اور تمدّنی اختلاف کی وجہ سے فروعات میں شرعی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے قدرے اختلاف تھا لیکن پیغام الہٰی کا اصل الاصول ایک ہی تھا اور وہ توحید تھی۔ اسی چیز کے پیش نظر اہلِ کتاب کو کلام اللہ میں مخاطب کر کے اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ اے اہلِ کتاب سب کے سب اس کلمہ کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں مشترک ہے کہ ہم اللہ کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی اور ہستی کو اس کا شریک نہ بنائیں، اور ہم میں سے کوئی بھی کسی قسم کی مخلوق کو پروردگار کی طرح اپنا حاجت روا نہ بنالے اے رسولؐ اگر وہ اس بات سے منہ پھیر لیں تو آپ ان سے کہ دیں کہ تم گواہ رہو ہم سب مسلمان ہیں (اور تم روگردان ہو)

یعنی توحید کی فطری تعلیم کو دھڑلّے سے اور بے دھڑک پیش کرنے کا حکم ہے۔

اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ گذشتہ اُمتوں میں بھی ان کی تعلیم کا اصل الاصول توحید خداوندی ہی تھا پھر کوئی تثلیث پر ایمان لے آیا کسی نے اپنے کاہنوں اور سرداروں اور اقتدار رکھنے والے لوگوں کو خدا بنا لیا' کسی نے آگ کی پوجا شروع کر دی' کوئی پتھر کے سامنے سر جھکانے لگا۔

اللہ تعالےٰ نے قرآن پاک میں اہل ایمان سے یہ وعدہ کیا تھا کہ جب تک تم میں ایمانی اور ایقانی مضبوطی قائم رہے گی اور تم اعمال صالحہ اور خوف خدا کے ہتھیاروں سے مسلح رہو گے تم دُنیا اور اہل دُنیا پر غالب اور مقتدر رہو گے۔

چنانچہ یہی تہذیبی عوامل یعنی ایمان اور عمل صالح جب تک مسلمانوں میں بخوبی موجود رہے اور وہ ان سے کام لیتے رہے اس وقت تک مسلمانوں کو اقوام عالم پر غلبہ اور اقتدار حاصل رہا جب تک وہ خود توحید الٰہی کے نظریہ کی عملی تفسیر بنے رہے اور اس جذبہ سے پوری طرح وابستگی اور سرشاری ان کے عمل میں نمایاں رہی اس کی خاطر وہ ایثار و قربانی دینے پر کمر بستہ رہے اور عمل پیہم سے کارکردگی میں سرگرمی دکھاتے رہے تو انہیں قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے اسلام کے پیغام کو مشرق و مغرب میں پھیلا دیا وہ دُنیا کی بڑی بڑی اور جابر سے جابر قوم سے ٹکرائے اور کہیں شکست نہ کھائی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو انہوں نے انتہائی شیفتگی اور عشق کے جذبات سے سرشار ہو کر دُنیا کے کونے کونے میں پھیلایا اور حضورؐ کے دُنیا سے تشریف لے جانے کے ایک سو سال کے اندر اندر دُنیائے معلومہ کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں اسلام کا پیغام نہ پہنچا ہو' چین سے لیکر مغرب اقصیٰ یعنی سپین و مراکش تک اور برما سے لیکر مغرب میں آسٹریا ہنگری تک اسلام کا پرچم لہرانے لگا تھا۔ یہ قرون اولیٰ کے مسلمان تھے جن میں نظریاتی و عملی اتحاد تھا' دُنیا میں ایک ہزار سال تک انہیں نفوس قدسیہ کی قوت ایمانی نے "اناولاغیری" کا ڈنکا بجایا تھا لیکن گذشتہ چند صدیوں سے اہل اسلام کی ترقی میں رُکاوٹ پڑ گئی ہے۔ ان میں صفات حسنہ اور اخلاق حمیدہ کی جگہ دوسری اقوام کی تقلید میں نئے نئے نظریات کی قبولیت کی وجہ سے اتحاد و اتفاق کی جگہ جغرافیائی تنگ دلانہ اور قومیتی نظریے جگہ لے رہے ہیں' نہ ان میں اسلاف کی ہمت ہے نہ پُرانے مجاہدوں کے سے نظریاتی خیالات ہیں' انہیں حالات کو بھانپ کر مغرب کے شاطر و عیار کھوکھلی تہذیب والے اور بقول

علامہ اقبالؒ ساحرِ فرنگ کی عیاری سے مسلم اقوام متاثر ہوئیں' ان میں بجائے علوہمتی کے بزدلی اور بجائے اتحاد کے قبائلی اور جغرافیائی اور قومی جذبات نے پرورش پانی شروع کر دی عقائد سے تعلق کمزور ہو گیا مقاصد سے پہلے جیسی وابستگی نہ رہی ایثار و قربانی کی بجائے خود غرضی اور تنگ نظری نے جنم لے لیا تو ان میں عملی جوش مفقود ہو گیا اور اس طرح وہ بڑی آسانی سے شاطر فرنگ کی غلامی کے شکنجے میں کَسے گئے۔ دینی حس کے مفقود ہونے کا نتیجہ ان کی دنیوی اور مادی تنزل اور انحطاط کی شکل میں ظاہر ہوا شاطر فرنگ نے ان کے اتحاد کو پارہ پارہ کر کے ان میں چھوٹی چھوٹی جغرافیائی وحدتوں اور محدود قومیت کے سبز باغ دکھا کر اپنے دام تزویر میں پھنسا لیا اور ان کی آزادی چھین کر غلامی کا جوا ان کی گردن میں ڈال کر انہیں ذلیل و خوار کر دیا۔ اس طرح جو جماعت یا اُمت دُنیا کی رہنمائی کے لئے پیدا کی گئی تھی وہ خود اپنے سے زبردست اور غالب حریف کا کلمہ پڑھنے لگی۔ تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے !

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

یہ ہے ایک صالح اور خیر الامۃ کا عروج اور زوال۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ فرنگی اقوام فطری اصول پر عمل کرنے والی ہیں اور اس طرح وہ دُنیا کے سیاہ و سفید پر قابض ہو گئی ہیں' بلکہ اب بھی مسلم قوم میں ہی حکمرانی اور جہاں بانی کی صلاحیت موجود ہے وہ اپنا کھویا ہوا مقام پھر سے حاصل کر سکتی ہیں بشرطیکہ وہ ان اصولوں اور عوامل پر سختی سے کاربند ہوں جن پر ان کے اسلاف کاربند تھے۔ یہود کے غلبہ کی مثال آپ کے سامنے ہے خُدا تعالےٰ کا ارشاد ہے کہ یہ ایک مغضوب قوم ہے اسے دُنیا کے ایک چپہ پر بھی حکومت حاصل نہیں ہو سکتی تو اگر یہ مسلمانوں کی اور عربوں کی غفلت اور غلط طریق کار کے اختیار کرنے سے فلسطین کے ملک پر قابض ہو چکے ہیں تو کیا ہوا اب بھی عربوں کو اسلامی اتحاد کا سبق یاد آ جائے اور دُنیائے اسلام کے غیر عرب مسلمانوں سے ان کا برتاؤ مناسب ہو اور ان کے رہنماؤں میں ان کے اسلاف کے سے جذبات اور قوت عمل کا ظہور ہو تو اب بھی اسرائیل کا تختہ اُلٹ سکتا ہے اور اس کا نام صفحہ ہستی سے محو ہو سکتا ہے۔ یہ اسرائیل کی حکومت کا قیام تو محض عربوں کو ان کی غلط کاری پر تنبیہہ کی صورت میں خدا کی طرف سے ایک سزا کے طور پر ہوا ہے۔ لیکن خدائی قانون میں

غلط کار قوم کو خواہ وہ کلمہ گو ہی کیوں ہو سزا ضرور ملتی ہے اپنے زریں اصول کو ترک کر کے اور خدائی قانون کو پس پشت ڈال کر ہر قوم کا انجام عبرتناک ہو سکتا ہے' اس میں عربوں کی تخصیص ہے نہ غیر عربوں کی۔

اسلامی تہذیب کے عوامل

اسلامی تہذیب پر جو عوامل اثر انداز ہوتے ہیں ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔

(۱- نیابت الٰہی:- اسلام کی رو سے انسان خلیفۃ اللہ ہے جو کچھ دنیا میں انسان کے علاوہ دوسری مخلوق ہے' خواہ وہ حیوانات ہے یا نباتات یا جمادات سب انسان کی خدمت کے لئے ہے اور خود انسان خدا کی عبادت کے لئے بنایا گیا ہے مغربی تہذیب کی رو سے انسان محض حیوان ناطق ہے' لیکن اسلام اختیار کر کے انسانیت بہت بلند مقام حاصل کر لیتی ہے مادی تہذیب میں انسانیت کی انتہائی ذلیل ہے کہ انسانوں کو جانوروں یا مشینوں کے برابر کر دیا جاتا ہے اور اسلام کی رو سے ایک مسلمان فرشتوں سے بھی افضل ہے

کہا منصور نے خدا ہوں میں ؛ ڈارون بولے بوزنا ہوں میں
ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست ؛ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

اب انسان اپنے سوا دوسری مخلوق کا آقا تو بن گیا' لیکن اس کے ساتھ کچھ قواعد اور پابندیاں بھی ہیں وہ مطلق العنان حکمران نہیں کہ جو چاہے کرے' لیکن خدا کے احکام کی ان پابندیوں سے گریز نہ کرے جو اس حاکمیت کے پورا کرنے کے لئے اس پر لگائی گئی ہیں۔ سب سے بڑی پابندی یہ ہے کہ وہ خود خدا کے احکام عبودیت و عبدیت کا لحاظ رکھے اور مخلوق سے جائز طور پر فائدہ اٹھائے اور یہ کبھی نہ بھولے کہ میں نے حاکم اعلیٰ کے سامنے جوابدہ ہونا ہے۔)

۲- مساوات و احترام انسانیت:- دنیا کا ہر گروہ یا امت خلیفۃ اللہ ہونے کی اہل ہے بشرطیکہ وہ ان شرائط کو پورا کرنے کی اہلیت رکھتا ہو جو اس کے لئے ضروری ہیں اس میں کسی کالے گورے یا مشرقی یا مغربی کی تخصیص نہیں خدا کے آخری دین پر عمل پیرا ہو کر اور فطرت الٰہی کے اصول پر عمل کر کے ہر انسان "نیابت الٰہی" کے شرف سے متصف ہو سکتا ہے

لیکن احترامِ انسانیت اور مساوات کے اصول پر عمل کرنا اس کی پہلی شرط ہے اسلامی معاشرہ میں کوئی اونچ نیچ نہیں، ہر کلمہ گو ایک دوسرے کا بھائی ہے، طبقاتی بُعد کا یہ سلسلہ عدمِ مساوات کا حامل ہے اسلامی تہذیب میں اس کا کوئی مقام نہیں۔

۳۔ فرد کا استحقاق:۔ اسلامی فلسفہ اخلاق کی رو سے فرد بااختیار اور کامل جواب دہ ہے وہ انفرادی طور پر اپنے فعل میں مکمل طور پر خود مختار ہے ہدایت اور گمراہی کی راہیں اختیار کرنے میں اس پر انفرادی طور پر کوئی پابندی نہیں کیونکہ گمراہی کی مضرت اور ہدایت کاری کی فلاح و بہبود اس پر فطری طور پر عیاں کر دی گئی ہے یہ خود مختاری یا قوت فیصلہ ایک ایسی قوت ہے جو انسان کے سوا کسی اور مخلوق کو ودیعت نہیں کی گئی، اب یہ اس کا ذاتی فعل یا اختیار ہے کہ جونسی راہ بھی وہ اختیار کرے کر سکتا ہے اسی طرح اسلامی تہذیب میں "لا اکراہ فی الدین" کا اصول کار فرما ہے۔ لیکن اگر کوئی انسان اپنے اس حق کو اختیار کر کے غلط راستہ اختیار کر لیتا ہے تو اُسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ اپنی پسند یا ناپسند کسی اور پر ٹھونسے اور بزور اسے غلط راستہ پر ڈالے اس طرح یہ اصول اسلامی تہذیب میں نمایاں مقام رکھتا ہے کہ انفرادیت پر اجتماعیت کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ موجودہ دور میں بعض غیر فطری تحریکوں میں کیا جا رہا ہے۔

۴۔ انسانی فطرت:۔ مسیحی تہذیب کی رو سے انسان پیدائشی گنہ گار ہے لیکن فطرت صحیحہ میں انسان اللہ کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے پیدائش کے بعد اس کے والدین یا شر پرست اسے غیر فطری یا مادی ماحول اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور بچہ بڑا ہو کر اس غیر فطری ماحول کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ اور اس طرح انسانیت کے شرف سے محروم ہو جاتا ہے حالانکہ اس کی فطرت اسے اسلامی اور خدائی فطرت کی طرف پکار پکار کر دعوت دیتی ہے۔ انسانی فطرت سے اسلام کو مایوسی نہیں ہوتی اس لئے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ تبلیغ دین سے غافل نہ رہے اور انسانیت کو فطرت اللہ کی طرف دعوت دیتا رہے اس منظم تبلیغ کی ذمہ داری پوری اُمت اسلامیہ پر ہے اگر اجتماعی طور پر اُمت اس فریضہ سے غافل رہے گی تو خدا کے عذاب کو دعوت دینے والی بات ہو گی، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اجتماعی نہ سہی انفرادی طور پر اور غیر منظم طریقے سے فریضہ کسی حد تک پورا ہوتا رہتا ہے۔ اسی لئے اُمت محمدیہ عذاب الٰہی سے اب تک

بچی ہوئی ہے۔

۵۔ آزمائش گاہ عالم۔ خداوند کریم کبھی عزت اور مال و دولت دیکر انسان کو آزماتا ہے کبھی افلاس اور ذلت دیکر اس کا امتحان لیتا ہے کہ بندہ کس قدر صبر و استقلال یا مردانگی سے ان آزمائشوں سے دو چار ہوتا ہے یا بے صبری اور ناشکری اور کفرانِ نعمت کا ارتکاب کرتا ہوا جہنم مول لیتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے کہ دولت دُنیا، زینت دُنیا، اولاد، مولیشی، زمین وغیرہ فتنہ ہیں اور اجر صرف اللہ کے پاس ہے۔ یعنی دینوی نعمتوں کو صحیح طریق پر خرچ کرنا اور خدا کی رضا کے مطابق خرچ کرنے سے یہی دولت اس کے لئے نعمت بن جاتی ہے اور دوسری صورت میں یہی وبالِ جان ہے۔ اولاد بدراہی اختیار کرکے والدین سے بدسلوکی کر سکتی ہے دولت اس کی بربادی یا قتل کا باعث بن سکتی ہے اس لئے یہ دولت اور اولاد بھی ایک آزمائش ہے اور افلاس اور تنگدستی بھی آزمائش ہے کوئی غیر معمولی افتاد پڑنے سے کسی کی ملازمت جاتی رہے یا مالِ اسباب پر ڈاکہ پڑ جائے، مکان کو آگ لگ جائے یا سیلاب کی نظر ہو جائے اچھے کھاتے پیتے انسان نانِ شبینہ کو محتاج ہو جائیں یا کوئی وبا پھوٹ پڑے تو ان آزمائشوں میں خدا کی یاد نہ بھولنے پائے اور انسان ہر تکلیف پر اور مصیبت پر اللہ تعالےٰ کی قدرتوں کی تو صیف ہی کرتا رہے اور اس سے دُعا کرتا رہے کہ تکلیف اور مصیبت دُور ہو تو گویا وہ شکر گزاری اور اطاعت خداوندی کے دائرہ میں ہے۔ اس کو اللہ ضرور اس کا اجر دے گا۔ اور وہ اس آزمائش میں پورا اترے گا۔ ورنہ مصیبت پر مصیبت ہو گی ناشکری کا اظہار کرنے سے اللہ تعالےٰ کی ناراضگی کو دعوت دیگا اور اور زیادہ مصائب میں مبتلا ہو گا۔

۶۔ اخلاقی قوت۔ جو قوم مادی وسائل کا درست استعمال کرتی ہے وہ ایک طرح سے اس اخلاقی قوت کی مالک ہے جو اسے اس قسم کے طرزِ عمل پر آمادہ کرتی رہتی ہے اور جس کے نہ ہونے سے وہی مادی اسباب و دینوی جاہ و حشم اس کے لئے وبالِ جان بن جاتے ہیں۔ یہ اخلاقی قوت ایک تحریک کی صورت اختیار کرکے دولت و مال کا درست مصرف اور استعمال سکھاتی ہے۔ قوموں کی زندگی میں مال و اسباب بمنزلہ جسم کے ہیں اور اخلاقی قوت روح کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور زندگی کے لئے جسم و روح دونوں ضروری ہیں۔ اب اخلاقی قوت کے

۱۲.

کے دو حصے ہیں۔

(۱) انسانی اخلاق۔ (ب) اسلامی اخلاق۔ یہ دونوں حصے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں انسانی اخلاق کی تکمیل کے لئے اسلامی اخلاق کا وجود ناگزیر ہے کیونکہ شرف انسانیت کے جوہر اسلامی اخلاق سے وابستہ ہیں۔ کلام الٰہی اور سنت نبوی میں جا بجا اخلاقی تعلیم کے باب کھلے ہیں اس لئے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسے اسلامی یا انسانی اخلاق کے اصول معلوم نہیں

۳۔ اسلامی تہذیب کے عناصر

اسلام خدا کا آخری دین ہے اور تمام ادیان کا منسوخ کرنے والا ہے اس سورج کے طلوع ہونے سے تمام ستاروں کی روشنی حتیٰ کہ چاند کی روشنی بھی معدوم ہو گئی ہے اسی کو اللہ تعالےٰ نے پسندیدہ اور بنی نوع انسان کا آخری دین قرار دیا ہے فرمایا اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَام یعنی اب دُنیا میں دین اسلام کے سوا اور کوئی دین خدا کا پسندیدہ نہیں بلکہ باقی تمام دین منسوخ ہو گئے اور خُدا کے آخری نبی مُرسل کے ذریعے سے آخری اور پسندیدہ دین ظہور میں آ گیا۔

ایک اور جگہ ارشاد ربانی ہے کہ جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کو اختیار کرے گا اسے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا یعنی دین اسلام آخری اور حتمی دین ہے اور یہ ہر لحاظ سے مکمل اور کامل قانون الٰہی ہے اس میں کسی قسم کی قطع و برید نہیں ہو سکتی نہ اس کے احکام میں اضافہ ہو سکتا ہے نہ ان میں کمی کا امکان ہے کیونکہ آخری وحی قرآن پاک ہے جس کی حفاظت کا ذمہ دار خود اس کا نازل فرمانے والا اللہ تعالےٰ ہے اور اسی پر دین اسلام مبنی ہے اسی دین پر دُنیا اور دین کے تمام معاملات استوار ہونے چاہئیں اسلام کی رو سے دُنیا کو آخرت سے علیحدہ نہیں کہا جا سکتا دُنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ یہ دار العمل ہے اور آخرت دار الجزا ہے جس کی دُنیا سنور گئی اس کی آخرت بھی دُرست ہو گئی حلقہ بگوش اسلام ہوتے ہی ہر ایک آدمی اسلام کے حصن حصین یعنی مضبوط قلعے میں داخل ہو جاتا ہے اب اس کا اللہ سے ایک معاہدہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے بندے کی حفاظت کرے اور بندے پر فرض ہے کہ وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کے اصولوں کو سمجھے اور ان پر پوری پوری طرح خاص انہماک اور دل کی گہرائیوں کے ساتھ متوجہ ہو

اور عمل کے میدان میں سرگرمی دکھائے۔ اسلام ان حقوق و فرائض کی مکمل رہنمائی کرتا ہے اور اسلامی تہذیب کا مکمل ڈھانچہ اور پختہ عمارت اسی سے تعمیر ہوتی ہے۔ اب ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ ہر جاندار کی جان و بدن کے مالک خداوند قدوس کی ذات سے جو تعلق اسلام قبول کرنے سے پیدا ہوتا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس ذات ارفع و اعلیٰ کے حقوق کا خیال رکھا جائے اس کو حقوق اللہ کہتے ہیں۔ ان حقوق کی نظریاتی شکل کا نام ایمان ہے اور عملی شکل اسلام کہلاتی ہے۔ ایمان کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ ایمان بالغیب ہو یعنی جو کچھ صادق و مصدوق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نکلا ہوا ہے بلاشک و تذبذب مان لینا ایمان بالغیب کہلاتا ہے۔ یعنی اس چیز پر ایمان لانا جو اپنی آنکھوں سے پوشیدہ ہو اور جسے حواس خمسہ ادراک نہ کر سکیں۔ اور ارکان اسلام میں سے ہر ایک رکن پر پورا پورا عمل کرنا

حقوق اللہ میں ایمان اور اسلام کے مقتضیات کو سمجھ کر ان پر عمل پیرا ہونا شامل ہے۔

۲۔ اللہ سے متعلق کے بعد انسان کا دوسرا فرض خدا کے بندوں سے تعلق پر مبنی ہے ان کے حقوق کا نام حقوق العباد ہے۔ ایک انسان کو دنیا میں آکر جن افراد سے واسطہ پڑتا ہے ان کے مختلف مدارج اور صورتیں ہیں ان کے حقوق کا خاص لحاظ رکھنا چاہیے۔ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن حقوق العباد کے بارے میں باز پرس ہوگی یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی آدمی حقوق اللہ تو ادا کرتا ہو لیکن حقوق العباد کا خیال نہ رکھتا ہو۔ اسے اس وقت تک نہ بخشا جائے گا جب تک اسے وہ بندے معاف نہ کر دیں جن کا حق اس نے غصب کیا ہوگا یا جس پر بے جا ظلم کیا ہوگا۔ جن بندوں سے ایک آدمی کے تعلقات دنیا میں ہوتے ہیں ان کے مختلف مدارج ہے جو درج ذیل ہیں۔

(۱) قریبی رشتہ داروں میں ماں باپ، بھائی بہن بیوی اور بچے شامل ہیں۔ ہر انسان کے یہ رشتے ناقابل تنسیخ ہوتے ہیں ان سے الگ نہیں ہوا جا سکتا۔ شادی غمی اور خوشی اور مرگ ہر گھر میں ہوتے رہتے ہیں ان مواقع پر رشتہ داروں سے الگ تھلگ رہنا ممکن نہیں ہوتا اسلام ان حقوق و فرائض کی کامل رہنمائی کرتا ہے جو اس ضمن میں پیش آتے ہیں ان کو عائلی زندگی کے حقوق و فرائض کہتے ہیں۔

(ب) عائلی زندگی سے بڑھ کر ایک عام آدمی کے تعلقات کنبہ کے افراد کے علاوہ باقی اقرباء کے

ساتھ بھی ہوتے ہیں اور دوست احباب سے بھی ہوتے ہیں خصوصاً ہمسایوں کے ساتھ تو بہت قریبی روابط ہوتے ہیں ان تمام حقوق و فرائض کو "معاشرہ" کے حقوق و فرائض کہتے ہیں کنبہ کے حقوق و فرائض کے ساتھ ساتھ اسلام معاشرہ کے حقوق و فرائض کا تعین بھی کرتا ہے۔

(ج) "شہری کے حقوق و فرائض" ایک مسلم ریاست کا شہری ہونے کی حیثیت میں ایک انسان پر حکومت کے حقوق و فرائض بھی عائد ہوتے ہیں ان کا تعین بھی اسلام بڑی خوبی سے کرتا ہے۔ اور اسے اسلامی ریاست کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(د) "بین الاسلامی تعلقات" یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اسلامی ریاستوں کی وسعت مراکش سے لیکر انڈونیشیا تک دُنیائے معلومہ کے تینوں بڑا عظموں پر محیط ہے۔ اور یہ بھی کہا جا چکا ہے کہ اس وقت دُنیا کی سب سے بڑی تعداد والی قوم مسلم قوم ہے اس کے علاوہ مسلمان وہاں بھی آباد ہیں جہاں بدقسمتی سے غیر اسلامی حکومتیں قائم ہیں مثلاً ہندوستان چین روس وغیرہ اب "کل مومن اخوۃ" کے اصول پر عمل پیرا ہوتے ہوئے ایک مسلمان کا فرض یہ بھی ہے کہ دوسرے مقام کے مسلمانوں سے ملے جلے ان کے دُکھ درد میں شریک ہو اور ان کی مدد کے لئے ہر طرح مساعی اختیار کرے۔ یہ ہے ایک مسلمان کی بین الاسلامی حیثیت۔ اس سلسلہ میں بھی اسلام کی تعلیم میں اس کے لئے مکمل رہنمائی موجود ہے۔

(ہ) تبلیغ و جہاد۔ مسلم قوم دُنیا کی بہترین قوم ہے خداوند تعالےٰ نے اس قوم کو "خیر امۃ" فرمایا اور ساتھ ہی فرمایا کہ وہ لوگوں کی اصلاح کے لئے بھیجے گئے ہیں تاکہ ان کو نیکی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں۔ اقبال فرماتے ہیں۔

افرنگ ز خود بے خبرت کرد و گرنہ

اے بندۂ مومن تو بشیری تو نذیری

اس کا ترجمہ یہ ہے کہ اے مسلمان انگریزوں کی غلامی کی وجہ سے تو اپنے مقام سے بے خبر ہو چکا ہے تیرا مقام تو نبیوں اور مرسلوں کا مقام ہے تو خدا کے عذاب سے ڈرانے والا اور نیک لوگوں کو جنت کی بشارت دینے والا ہے۔ یعنی انبیا کا جانشین ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل۔ یعنی میری اُمت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہو چکی ہے اب نبی تو نہیں آئے گا

البتہ حضورؐ ہی کا پیغام یعنی اسلام کی اشاعت کے لئے علماء و مبلغین اسلام اپنا کام مسلسل اور ان تھک محنت سے صبر و استقلال سے جاری رکھیں گے اور اس طرح وہ بنی اسرائیل کے نبیوں جیسا کام کرینگے ایک اور جگہ ارشاد نبویؐ ہے" الدین النصیحۃ" یعنی دین خیر خواہی کا نام ہے گویا تبلیغ دین میں منکرین و کافروں کی خیر خواہی ہے کہ انھیں اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لایا جائے۔

ایک نکتہ لطیف - دشمنان اسلام یہ پرپیگنڈا کرتے نہیں تھکتے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا گیا وہ ہمارے رہنماؤں حضرت خالد بن ولیدؓ سیف اللہ اور دیگر صحابہ کرام سلطان صلاح الدین سلطان نور الدین زنگی، سلطان محمود غزنوی، سلطان علاؤالدین خلجی سلطان اورنگ زیب عالمگیر وغیرہ کو ایک متعصب اور تنگ نظر سر پھرے اور خونخوار انسان کے روپ میں پیش کرکے ان پر اسلام کی بزور شمشیر اشاعت کا الزام لگاتے ہیں اور مشہور کرتے ہیں کہ انہوں نے جبر اور قہر سے حکومت کی اور بہت سے غیر مسلم گھرانوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کر دیا اور ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ اسلام قبول کرنے کے سوا ان کو اور کوئی چارہ ہی نہ رہا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اوّل تو یہ الزام ہی بالکل از سر تا پا غلط ہے جس غلطی اور الزام تراشی کا سب سے بڑا ثبوت وہ علاقے اور منطقے ہیں جہاں اسلام کے مجاہد کبھی نہ پہنچے تھے اور جہاں کسی زمانے میں بھی اسلامی حکومت قائم نہ ہوئی تھی مثلاً چین اور انڈونیشیا کے وسیع ممالک جہاں اس وقت کروڑوں کی تعداد میں مسلمان موجود ہیں۔ دوسرے اگر یہ الزام بفرض محال درست بھی مان لیا جائے تو ہم آج کل کے مسلمانوں کو جو ایسے علاقوں میں بستے ہیں جہاں آج سے چند سو سال پہلے مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی اور جہاں کے اکثر خاندانوں کے اکابر آج سے چند سو سال پہلے یقیناً غیر مسلم تھے اور بقول دشمن اسلام مورخین کے انھیں بالجبر اسلام قبول کرایا گیا ان مجاہدین اور مبلغین کا ممنون ہونا چاہیئے جنہوں نے ہمارے اکابر کو اسلام کی دعوت دی اور کوئی رضا و رغبت سے مسلمان ہو گیا یا اسے جبراً مسلمان بنایا گیا۔ بہر حال ان اکابر کے اسلام کے متعلق تو ہمیں معلوم نہیں کہ دل سے وہ مسلمان تھے یا نہیں البتہ ان کے بعد آنے والی اُن کی نسلیں ضرور مجاہدین کی ممنون ہیں کہ انہیں اس دولتِ اسلام سے مالا مال کیا گیا۔ ورنہ ہم بھی آج کسی بتخانے کے آگے ذلیل ہو کر اور انسانیت کی تذلیل کرتے ہوئے پتھروں اور مورتیوں کے آگے سر جھکاتے اور توحید سے بے بہرہ رہ کر انسانیت کی تذلیل کا باعث ہوتے۔

یہ نکتہ برسبیل تذکرہ لکھا گیا ہے۔ اور اس سے جہاد فی سبیل اللہ اور تبلیغ اسلام کے فرائض کی وضاحت مقصود ہے۔ جہاد کی کچھ شرائط ہیں اور تبلیغ کے کچھ آداب ہیں جو انشاء اللہ اپنے مقام پر لکھے جائیں گے۔ یہاں تو اسلامی تہذیب کے عناصر کی فہرست میں شامل ارکان کا مذکور ہے۔

(۹) مندرجہ بالا تعلقات کی وضاحت کا اسلام کی رو سے یہ طریق کار ہے کہ اس اُمر کے لئے اسلامی نظریہ تعلیم و تربیت کی اہمیت واضح کی جائے کہ یہ ہے اسلامی نظام تعلیم و تربیت۔ اس حیثیت میں انسان کی دو حیثیتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک بحیثیت معلّم اور دوسری بحیثیت متعلم یعنی شاگرد کی حیثیت اور استاد کی حیثیت میں ان دونوں صورتوں میں ان پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوں گی۔ جن سے عہدہ برآ ہونا ضروری ہے۔

خلاصہ

مندرجہ بالا تفصیل کو اختصار کے طور پر اس طرح درج کیا جاتا ہے - اس سے ایک مسلمان کی زندگی کے مختلف مراحل اور مختلف النوع تعلقات اور ذمہ داریاں واضح ہو جائیں گی۔

۱ - خدا کے ساتھ تعلقات - اس میں اجزائے ایمان و ارکان اسلام کا مذکور ہو گا۔

۲ - انفرادیت - یعنی ایک انسان اپنی انفرادی حالت میں کیسا ہونا چاہیے۔ یا تعلق بالنفس

۳ - عائلی زندگی - کنبہ سے روابط کیسے ہوں۔

۴ - معاشرتی زندگی - یعنی اپنے گرد و پیش کے ماحول میں اس کے حقوق و فرائض کا تعین۔

۵ - اسلامی ریاست - یعنی انسان بحیثیت ایک شہری کے۔

۶ - بین الاسلامی تعلقات - ایک مسلمان کے یا ایک اسلامی حکومت کے باقی دنیا کے مسلمانوں یا حکومتوں سے کیسے روابط ہوں۔

۷ - عالم انسانیت - عام انسانوں کی بھلائی و بہبود کے لیے ایک مسلمان کہاں تک اور کن حدود میں کام کر سکتا ہے - ان عنوانوں پر آئندہ صفحات میں تفصیل سے بحث کی جائے گی۔

باب (۳)

اسلامی اخلاق

اگرچہ کسی تعمیر کے لئے اینٹ مصالحہ لوہا لکڑی مزدور اور پتھر مٹی وغیرہ ضروری ہیں اور ان کے بغیر کوئی عمارت کھڑی نہیں کی جاسکتی، لیکن اس کی تزئین و آرائش کے لیے رنگ، دار ٹائلیں ابری دار فرش جھاڑ فانوس اعلیٰ فرنیچر شگوفے اور دوسری آسائشیں بھی عمارت کے حسن کو نہ صرف دوبالا کرتی ہیں بلکہ مکین کے حسن ذوق اور نمود و نمائش کے ذوق کو بھی اجاگر کرتی ہیں، یہی مثال اسلامی زندگی کی ہے۔ اس میں حقوق و فرائض تو ضروری اجزا ہیں۔ لیکن آداب و فضائل ان میں حسن و جمال پیدا کرتے ہیں اور ان کے ساتھ ہی ساتھ رذائل کا علم بھی اہم ہے تاکہ ان سے حتی الامکان بچا جائے۔ اور ان کی بجائے فضائل کا استعمال کیا جائے۔ اس طرح اسلامی زندگی کی عمارت میں تین طرح کا مصالحہ استعمال ہوتا ہے۔

۱۔ حقوق و فرائض۔
۲۔ فضائل و رذائل۔
۳۔ آداب۔

ان تینوں کے مجموعے کا نام اسلامی اخلاق ہے۔ تہذیب اسلام کے عناصر سے متعلق مفصل بحث کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ ذیل چند ایک عنوانات کا جائزہ لیا جائے تاکہ آئندہ مباحث بخوبی واضح ہو سکیں۔

۱۔ اسلامی اخلاق سے کیا مراد ہے۔
۲۔ اسلام کے نظریہ اخلاق کی امتیازی خصوصیت یہ ہے

۳۔ اسلامی اخلاق کی اہمیت کس وجہ سے ہے۔
۴۔ اسلام کے نزدیک نیکی کا مفہوم کیا ہے۔

اسلامی اخلاق

اخلاق خُلق کی جمع ہے۔ عربی کے دو الفاظ خَلق اور خُلق ایک ہی مادہ سے مستخرج ہیں۔ اس لئے ان کے معانی میں بھی مناسبت پائی جاتی ہے۔ خَلق کا تعلق ظاہری صورت سے ہے اور خُلق کا باطنی صورت سے ہے۔ مخلوق کی ترکیب دو چیزوں سے ہوتی ہے جسم اور روح، جسم ہم اپنی ظاہری آنکھوں سے دیکھتے ہیں لیکن روح کا ادراک صرف بصیرت یعنی باطنی آنکھوں سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے بھی جسم انسانی کی نسبت تو مٹی سے کی ہے لیکن روح کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔

إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّن طِينٍ فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ ۝

بے شک میں پیدا کرنے والا ہوں بشر کو مٹی سے پھر جب میں اسے درست کر دوں اور اس میں روح پھونک دوں تو تم سب (اے فرشتو) اس کے آگے سجدہ میں گر پڑو۔

یعنی وہ سجدہ آدمی کے جسم کو نہ تھا بلکہ اس کی روح کو تھا اس طرح روح کی جسم پر برتری اور فضیلت ثابت ہوئی اسی طرح خُلق کو بھی خَلق پر فضیلت حاصل ہے۔

امام غزالیؒ کی تعریف کے مطابق خُلق نفس کی ایسی کیفیت اور ہیئت راسخہ کا نام ہے جس کی وجہ سے بسہولت اور فکر و توجہ اور سوچ بچار کے بغیر اعمال صادر ہو سکیں۔ اگر یہ ہیئت اسی طرح قائم ہے کہ اس سے عقل و شرع کی نظر میں اعمال حسنہ ہی صادر ہوتے ہیں تو اس کا نام خُلق حسن ہے اور اگر اس سے غیر پسندیدہ افعال کا صدور ہوتا ہے تو اسے خلق سیئی یا بدخلقی کا نام دیا جاتا ہے۔

مزید فرماتے ہیں کہ اس سلسلے میں چار باتیں قابل لحاظ ہیں۔

۱۔ عمل جمیل۔ یعنی اچھے یا برے افعال کا عمل۔
۲۔ قدرت ۔ یعنی اس کے کرنے یا نہ کرنے کی قدرت ہو۔

۳۔ معرفت ۔ یعنی اس کی اچھائی یا برائی کو پہچاننا۔

۴۔ میلانِ نفس ۔ یعنی نفس کی وہ ہیئت یا صورت جس سے دونوں جانبوں یعنی خیر یا شر کی جانب میں سے کسی ایک طرف میلان ہو سکے اور اس کے ذریعے دونوں میں کسی جانب مائل ہونے میں آسانی ہو۔ لیکن پہلی بات یعنی نفسِ عمل خلق نہیں کہلاتا۔ کیونکہ ایک شخص میں خلقِ سخاوت ہونا اور بات ہے لیکن غریب ہونے کی وجہ سے مال خرچ کرنے سے قاصر ہونا دوسری صورت۔ اس طرح یہ بات یعنی عملِ جمیل خلق نہیں بن سکتا۔ اسی طرح قدرت بھی خلق نہیں بن سکتی کیونکہ یہ صورت تو کرنے اور نہ کرنے میں یکساں عامل ہے پھر اسے خلق کا نام کس طرح دیا جا سکتا ہے اسی طرح معرفت کا نام بھی خلق نہیں کیونکہ اس کی نسبت بھی اچھے اور برے دونوں قسم کے اخلاق و صفات سے ہے۔

البتہ خلق اس چوتھی صورت کا نام ہے۔ جس کو ہیئت کہا جاتا ہے اور جو نفس کو اس قابل بناتی ہے کہ اس سے عطا و بخشش یا بخل و کنجوسی صادر ہو جس طرح چہرہ کا حسن ناک و رخسار اور ہونٹوں کے بغیر صرف آنکھوں کی خوبصورتی ہی سے کامل نہیں ہوتا۔ اسی طرح باطن کا حسن بھی ان چار ارکان کے بغیر کامل و مکمل نہیں ہو سکتا، اور جب ان سب کے اختلاط سے اعتدال و تناسب کے مطابق مزاج پیدا ہو جاتا ہے تو پھر حسنِ خلق وجود میں آ جاتا ہے۔

یہ واضح ہو گیا ہے کہ اخلاق سے مراد انسانی سیرت و کردار ہے۔ جس کی بدولت تمام افعال و اعمال ایک ہی سمت میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اگر وہ نیک اعمال کی طرف مائل کرتے ہیں تو انہیں اخلاقِ حسنہ (اچھی عادت) کہا جاتا ہے اگر ان کی وجہ سے برے اعمال کی ترغیب ہو تو انہیں اخلاقِ سیئہ (بری عادات) کہا جاتا ہے۔

اسلامی اخلاق سے مراد بھی وہی اخلاق ہیں جن کو اپنانے پر اسلام نے بہت زور دیا ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ اسلامی اخلاق درحقیقت وہی انسانی اخلاق ہیں جن کی خوبی اور اچھائی کے متعلق ہر زمانہ میں فطرتِ انسانی کا فیصلہ صادر ہوتا رہا ہے۔ ہر انسان انہیں پہچانتا ہے اور دنیا کے ہر بڑے مذہب نے ان کی تائید کی ہے۔ ہر انسان جانتا ہے کہ جھوٹ بولنا برا ہے، سچائی اچھی خصلت ہے۔ ظلم برا ہے، عدل و انصاف قابلِ تعریف ہے۔ حیا فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے بے حیائی قابلِ مذمت ہے۔

لیکن اسلام اِن عالمگیر صداقتوں کو ایک نصب العین کی حیثیت سے پیش کرتا ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ (یعنی مجھے خدا نے اس لئے دُنیا میں بھیجا ہے کہ میں پسندیدہ اور باعزت اخلاق کی تکمیل کردں۔

اِسلام میں حقوق اللہ اور حقوق العباد سے مُراد اُسی اخلاق حسنہ کی تکمیل ہے اور قرآن و سنّت کے تمام احکام کا نتیجہ انہی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

حکمار کہتے ہیں کہ جس طرح ظاہری حسن چاروں اعضاآنکھیں ناک مُنہ رُخسار کے باہمی تناسُب و اعتدال پر موقوف ہے اِسی طرح باطنی حُسن چار قوتوں علم۔ غضب۔ شہوت اور عدل۔ کے اعتدال کا نام ہے۔ جس سے چار اصولی اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔ حکمت' شجاعت' عفت اور عدل۔ جنہیں امہات الاخلاق کہا جاتا ہے۔ باقی جملہ اخلاق انہیں سے پھوٹنے والی شاخیں ہیں۔ امام غزالیؒ اپنی مشہور عالم تصنیف" احیاء علوم الدین" میں فرماتے ہیں کہ یہ چاروں اخلاق کامل اکمل طور پر صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات میں پائے جاتے تھے باقی انسان اپنی کوشش اور درجۂ اطاعت سے جتنا قرب آپؐ کی ذات سے حاصل کرتے جاتے اسی قدر وہ خدا کے نزدیک ہوتے چلے جاتے ہیں۔

اِسلام کا نظریہ اخلاق

ہر عمل سے پہلے کرنے والے کے دل میں ایک تحریک پیدا ہوتی ہے جو اس عمل کے ظہور کا باعث ہوتی ہے لیکن یہ تحریک کسی خاص نظریے کے تابع ہوتی ہے' اسی طرح گویا ہر عمل کی بُنیاد ایک نظریہ ہوتا ہے۔ جب کوئی انسان کوئی نیک عمل کرتا ہے تو اس کے پیچھے مختلف نظریات ہوتے ہیں جن میں سے دو قابلِ قدر ہیں۔

۱- نیک کام کو نیک سمجھ کر کرنا۔
۲- نیک کام کو خُدا کا حکم سمجھ کر کرنا۔

اسلام میں عمل صالح کو ایمان کے بعد دوسرا مقام حاصل ہے جس جگہ بھی قرآن پاک میں عمل صالح کا لفظ آیا۔ اس کے ساتھ ایمان کا لفظ ضرور آیا ہے۔

وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ایمان کے بغیر عمل صالح کا ظہور اسلام کی رو سے ممکن ہی نہیں اور خدا کی ابدی نعمتوں کے مستحق اعمال صالحہ کے کرنے والے ہی ہوسکیں گے اور ساتھ ساتھ ان میں دولت ایمان کی فراوانی بھی ہوگی۔

اسلامی اخلاق اعمال صالحہ ہی کا دوسرا نام ہے یہ ظاہر ہے کہ جب اخلاق سے مُراد نیک اعمال ہیں تو ان کی بنا بھی مذکورہ بالا دونوں نظریوں میں سے کسی ایک پر ہوگی، چنانچہ اسلامی تعلیمات کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام دوسرے نظریے کو ان کی بُنیاد قرار دیتا ہے۔ یعنی ایک مسلمان نیک اعمال صرف اس لئے کرتا ہے کہ وہ خدا کا حکم ہے اس میں اس کی کسی ذاتی یا نفسانی غرض کو دخل نہیں ہوسکتا وہ ایک غریب کی مدد کرتا ہے اس لئے نہیں کہ وہ غریب ہے بلکہ اس لئے کہ غریب کی مدد خدا کا حکم ہے۔ وہ بھوکے کو روٹی کھلاتا ہے اس لئے نہیں کہ وہ بھوکا ہے بلکہ اس لئے کہ خدا کا حُکم ہے کہ مسکین اور نادار کو کھانا کھلاؤ۔ وہ رفاہ عامہ کا کوئی کام کرتا ہے تو محض خدا کا حکم سمجھ کر، الغرض ایک مسلمان کے تمام اعمال کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہے اس لئے اگر وہ کسی پر نیکی کر کے احسان جتا دیتا ہے تو اس کی نیکی ضائع ہو جاتی ہے اور خدا کے ہاں اس کا کوئی اجر نہیں ہوتا۔ قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے۔ لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى۔ یعنی اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور تکلیف دیکر ضائع نہ کرو۔ یعنی اگر وہ نیکی خدا کا حُکم سمجھ کر کرتا تو پھر احسان جتانے کے کوئی معنی ہی نہیں اگر احسان جتایا تو معلوم ہوا کہ وہ نیکی خدا کا حُکم سمجھ کر نہیں کی گئی، بلکہ احسان کی غرض سے کی اس لئے وہ نیکی ضائع ہوگئی۔ اسلام اس نظریے کو حسنِ نیت اور خلوص عمل کا نام دیتا ہے جس عمل کے پیچھے حسن نیت اور خلوص عمل نہیں اس کی کوئی قدر و منزلت نہیں حسن نیت کی اہمیت کے متعلق قرآن و حدیث میں بہت زیادہ وضاحت موجود ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ۔ اور ان لوگوں کو اپنی سرکار سے نہ ہٹائیے جو صبح و شام اپنے خدا کی رضاجوئی کے لئے اُسے پکارتے ہیں۔ اس آیت میں "یریدون" سے مُراد نیت ہے۔ یعنی ان لوگوں کی نیت خدا کی رضا جوئی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ الخ میں بہت ہی

وضاحت سے نیّت اور ارادہ کا بیان کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ تمام اعمال کا دارومدار نیّت پر ہے اور ہر شخص اپنی نیّت کے مطابق ہی اس کا ثمرہ حاصل کرے گا۔ تو جس شخص کی ہجرت اللہ اور رسولؐ کی طرف ہے تو یقیناً اُس کی ہجرت اللہ اور رسولؐ ہی کی طرف ہے لیکن جس شخص کی ہجرت دُنیا کی کسی متاع کے لئے یا کسی عورت کو نکاح میں لینے کی غرض سے ہو تو اس کی ہجرت میں اللہ اور رسولؐ کی بجائے متاعِ دُنیا اور عورت کی غرض متصوّر ہو گی اور اس کا اَجر بھی اسی حد تک محدود رہے گا۔ ہجرت کرنے میں انسان کیا کیا تکلفیں نہیں اٹھاتا، گھر بار، شہر قریہ دوست، آشنا، بچپن کے تصوّرات اور مانوس مقامات اور علائق دیرینہ کو چھوڑتا ہے پھر اگر اس عظیم قربانی میں بھی اس کے دل میں خلوص نہیں اور اللہ اور رسولؐ کے حکم یا اُن کی اطاعت کی بجائے کسی اور غرض کو ترجیح دیتا ہے تو اس کی ہجرت خدا اور رسولؐ کے ہاں کوئی حیثیت نہیں رکھتی اس کی تمام قربانی اور ایثار اور ترک خانہ و وطن خدا اور رسولؐ کے ہاں اکارت گئے۔ ایک آیت میں ارشاد خداوندی ہے کہ اللہ تعالےٰ تمہاری صورتوں اور اموال کی طرف نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دِلوں اور اعمال کی طرف دیکھتا ہے کہ ان میں خلوص کتنا ہے اور منافقت اور ریا کا کتنا حصّہ ہے۔ اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ غزوہ تبوک کے موقعہ پر حضورؐ نے فرمایا کہ کئی مومن مدینہ منوّرہ میں ہیں لیکن تمام کے تمام اعمال جہاد میں ہمارے شریک ہیں صحابہ نے عرض کی یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ کیسے ۔ فرمایا ان کی نیّت تھی کہ وہ جہاد میں شریک ہوں۔ لیکن کسی عذر کی بنا پر شریک نہیں ہو سکے ۔ لہٰذا وہ حسن نیت کی وجہ سے شریکِ ثواب ہیں اسی طرح اور بہت سی احادیث اور آثار سے نیّت کی اہمیت ثابت ہے۔ چنانچہ اگر نیت نیک ہے تو عمل بھی نیک ہے اگر نیت بُری ہے تو عمل بھی بُرا ہو جاتا ہے۔ خواہ بظاہر نیک ہی دِکھائی دے۔ مثلاً ایک آدمی دکھاوے کی نماز پڑھتا ہے کہ لوگ اسے نمازی سمجھ کر اس کی تعریف کریں یا کسی عیب کو چھپانے کے لئے کوئی نیکی کرتا ہے تو اس نمازی کی نماز الٹی اس کے لئے وبالِ جان بن جاتی ہے۔

تو واضح ہوا کہ اسلامی نظریہ اخلاق کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطابق اعمال خدا کا حکم سمجھ کر کئے جائیں، اس لئے اس کی عملی صورت عبادت میں داخل ہے اور عبادات کی مقبولیت کا دارومدار حُسنِ نیّت اور خلوص پر ہوتا ہے۔ حُسنِ نیت کیا ہے ؟ صرف رضائے الٰہی کا حصول جس کے ساتھ ذاتی یا نفسانی اغراض کا کوئی تعلق نہیں۔

اہمیّت وفضیلت

اخلاقِ حسنہ کی اہمیت اسی سے واضح ہو جاتی ہے کہ یہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت ہے قرآن مجید میں اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ۔ بیشک آپ کا خلق بہت بڑا ہے۔ اور ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ کَانَ خُلُقُہُ الْقُرْآنَ ۔ یعنی حضورؐ کے خلق کی زندہ تصویر قرآن پاک ہے گویا آپ قرآن مجسم تھے۔ یعنی اطاعتِ خداوندی کی عملی تصویر تھے ان کا کوئی کام بھی خدا کے کنٹرول یا اختیار سے باہر نہ تھا۔ اسی لئے آپؐ کی ذات ستودہ صفات اُمت کے لئے اسوہ حسنہ یعنی بہترین قابل تقلید نمونہ تھی تو معلوم ہوا کہ جب آپؐ کو اخلاق حسنہ کا اتنا اہتمام تھا تو آپ کے متبعین کے لئے اس کی اہمیت کس قدر زیادہ ہوگی۔

ایک دفعہ ایک آدمی حضورؐ کے پاس سامنے سے آیا اور سوال کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا دین حسن خُلق کا نام ہے پھر وہ واپس جا کر دائیں طرف سے آیا اور پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین کیا ہے آپؐ نے فرمایا حسن خلق۔ پھر وہ بائیں جانب سے آیا اور وہی سوال کیا آپ نے پھر وہی جواب دیا۔ پھر وہ پیچھے سے آیا اور وہی سوال دُہرایا آپؐ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ کیا تو نہیں سمجھا دین یہی ہے کہ تو غضبناک نہ ہو۔ ...... ایک اور روایت ہے کہ آپؐ سے پوچھا گیا سب سے افضل عمل کونسا ہے آپؐ نے فرمایا حُسن خُلق۔

حضرت فضیلؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا کہ فلاں عورت ہمیشہ دن کو روزہ رکھتی اور رات کو عبادت کے لئے کھڑی رہتی ہے لیکن وہ بدخلق ہے اور ہمسائے اس کی بدزبانی سے تنگ ہیں۔ فرمایا۔ اس میں کوئی نیکی نہیں وہ جہنمی ہے۔

تو اس سے خلوص اور ایمان کی اہمیت واضح ہوگئی اور خلوص ریاکاری کی ضد ہے یہی حُسن خلق کی فضیلت کی دلیلیں ہیں۔ اور اس سے اس عمل صالح کی اہمیت اور دُرست ...... طرزِ عمل پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

نیکی

اصلاح میں نیکی کا مفہوم کیا ہے اور اسلام کی رو سے نیکی کے لفظ کے کیا معنی ہے اس بات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

یوں تو دنیا کا ہر مذہب نیکی کی ترغیب اور برائی سے بچنے کا حکم دیتا ہے لیکن اس کے عملی نفاذ میں جو کردار اسلام نے ادا کیا ہے وہ کسی مذہب نے نہیں کیا۔ جتنے بھی دین یا مذہب دنیا کے تختہ پر ظاہر ہوئے وہ حضور ؐ کی ذات بابرکات سے پہلے کے تھے۔ مسیحیت، یہودیت، بدھ مت، زرتشتی مذہب، ستارہ پرست مذاہب، یہودی وغیرہ تمام مذاہب کے بانی حضور ؐ سے پہلے تشریف لائے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دنیا کا کوئی خطہ اور کوئی قریہ یا بستی ایسی نہیں جہاں ہم نے پیغمبر نہ بھیجے ہوں، اگر رد و بدل نہ ہوا ہوتا تو کسی نئے ہادی کے آنے کی ضرورت نہ تھی۔ حضور ؐ کی تشریف آوری کے وقت تمام دنیا میں شرک پھیلا ہوا تھا۔ مندرجہ بالا تمام مذاہب کے پیرو موجود تھے لیکن اصل خدائی اور الہامی تعلیم کا کہیں پتہ تک نہ تھا۔ اس لئے یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ اصلی اور الہامی تعلیم میں سے کچھ نہ کچھ حصہ ضرور محفوظ تھا۔ جو عام سمجھنے کی باتیں ہیں، درج ہیں کہ ان میں کسی کو بھی کوئی تامل نہیں ہوتا اس قسم کی باتیں ان گذشتہ کتابوں میں یا گذشتہ امتوں میں جو چلی آرہی تھیں ان میں نیکی کا مفہوم بڑا تھا لیکن اسلام نے نیکی کا جو جامع اور مکمل مفہوم پیش کیا ہے وہ گذشتہ امتوں کے یا اقوام کے مفہوم سے اختلاف رکھتا ہے۔ مسیحیت میں نیکی یہ ہے کہ دنیوی اور جسمانی خواہشات کو ترک کر کے دنیا سے منہ موڑ لیا جائے۔ اور کسی مذہب میں محض عبادت و ریاضت اور اپنے جسم کو بیجا طور پر تکلیف دینے ہی میں نیکی ہے۔ اور کسی نے محض خدمت خلق کو ہی نیکی سمجھا ہے اس میں شک نہیں کہ ان مفہوموں میں بھی کسی حد تک نیکی کا مطلب واضح ہو جاتا ہے لیکن جامع اور واضح اور ہمہ گیر نہیں کیونکہ نیکی کا مفہوم اپنے اندر بہت بڑی وسعت کا حامل ہے۔

قرآن پاک میں نیکی کے لیے بِرّ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کی ضد اثم ہے جس کا مطلب گناہ ہے۔ سورہ بقر میں بِرّ کا جو مفہوم واضح کیا گیا وہ نہایت جامع ہے اور اس میں پوری وسعت آگئی ہے اس سے بڑھ کر اس کے معانی میں وسعت ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

"یہ نیکی نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف پھیر لو بلکہ نیکی یہ ہے کہ اللہ پر یوم آخرت پر فرشتوں پر کتابوں پر اور نبیوں پر ایمان لایا جائے اور مال کی محبت اور اس سے دل بستگی کے باوجود اسے اللہ کے راستہ میں قریبیوں پر یتیموں پر مسکینوں پر مسافروں پر حاجتمندوں پر اور مقروضوں پر خرچ کرے اور نماز قائم کرے زکوٰۃ ادا کرے۔ اور جو وعدہ کرے اسے پورا کرے اور جنگ اور

تکلیف اور مصیبت کے وقت استقلال سے کام لے اور بے صبری سے بچے یہی لوگ صداقت والے ہیں اور یہی پرہیزگار ہیں۔

حضورؐ نے فرمایا کہ نیکی حسنِ خلق ہے اور گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے یعنی ضمیر ملامت کرے۔

ان آیاتِ کریمہ اور حدیث نبویؐ کو سامنے رکھ کر نیکی کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی گئی ہے۔ جس سے اس کا مفہوم خوب اچھی طرح متعین ہو جاتا ہے۔

(۱) نیکی صرف ایک سمت کی طرف بوقت نماز منہ کرنے ہی کا نام نہیں بلکہ اس میں خلوص درکار ہے۔

۲ - اس کے لئے سب سے مقدم ایمان اور یقین محکم کی ضرورت ہے اگر ایمان ہی درست نہیں تو اس کی نیکی، نیکی ہی نہیں رہے گی، بلکہ ایک شجر فرسودہ کی طرح کسی وقت بھی اکھڑ کر گر سکتی ہے۔

۳ - اپنا مال حقداروں مسکینوں، محتاجوں میں حسب ضرورت تقسیم کرنا نیکی ہے۔ اسے صرف اپنے ہی تصرف میں لانا نیکی کا ضیاع اور برائی اور گناہ ہے۔

۴ - نماز کا قیام، نیکی کی خاص علامت ہے۔

۵ - اسی طرح زکوٰۃ ادا کرنا بھی نیکی کی دلیل ہے اور زکوٰۃ سے انحراف کرنا گناہِ عظیم ہے۔

۶ - نیکی کے اجزاء میں اخلاق کی درستی ایفائے عہد اور صبر و ثبات بھی شامل ہیں۔

۷ - اپنی پسندیدہ اشیاء کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا نیکی ہے۔

۸ - نیکی حسن خلق کا نام ہے۔

غرضیکہ اسلام کی رو سے نیکی عقاید، اعمال اور اخلاق حسنہ کے مجموعے کا نام ہے ان آیات مقدسہ اور حدیثوں میں نیکی کی اس قدر واضح الفاظ میں تشریح کی گئی ہے کہ اس کا کوئی پہلو مخفی نہیں رہا۔ مسلمانوں کا ہر چھوٹے سے چھوٹا کام اور بڑے سے بڑا کام نیکی کے ضمن میں آتا ہے۔

حضورؐ نے فرمایا کہ یہ بھی نیکی ہے کہ کسی ایذا دینے والی چیز کو راستہ سے ہٹا دیا جائے اگرچہ یہ ایمان کی کمترین شاخوں میں سے ہے۔

آپؐ فرماتے ہیں۔ نیکی کی کسی بات کو حقیر نہ جانو اگرچہ وہ کسی سے خندہ پیشانی سے ملنا ہی کیوں نہ ہو نیز آپؐ نے فرمایا کہ اگر تم کسی کے ساتھ بھلائی نہ کر سکو تو اس کی سفارش ہی کر دو تاکہ کوئی دوسرا

باس کے ساتھ بھلائی کرے۔

انسان سے بھول چوک میں اور دانستہ یا نادانستہ کئی گناہ سرزد ہو جاتے ہیں ان کے وقوع پذیر ہونے کے بعد اگر بندہ ندامت اور شرمندگی کا احساس رکھتا ہے اور دل میں توبہ کرتا ہے اور ان گناہوں کے اعادہ سے کنارہ کشی ہونے کا اقرار کرتا ہے تو یہ بھی نیکی ہے اسے توبہ کہتے ہیں قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

"جو آدمی توبہ کرے ایمان پر ثابت قدم ہو جائے اور نیک کام شروع کردے تو اللہ تعالے ایسے لوگوں کی برائیوں کو نیکی سے بدل دیتے ہیں" ایک اور مقام پہ ارشاد باری ہے۔

"بے شک نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں"۔

حدیث میں آتا ہے جب آدمی نیکی کا ارادہ کرتا ہے' اور اسے پورا نہیں کر سکتا تو اللہ کے ہاں اس کی ایک نیکی لکھی جاتی ہے اور اگر نیکی کرلے تو اس کا اجر دس گنا سے لیکر کئی سو گنا تک لکھ دیا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اللہ کو نیکی بہت پسند ہے۔

اسلام میں نیکی صرف انسانوں تک ہی نہیں بلکہ اس کا دائرہ دوسری مخلوقات میں بھی اثرانداز ہے۔

مثلاً حضورؐ کا ارشاد ہے کہ جب تم کسی جانور کو ذبح کرو تو اچھی طرح کرو اور چھری بہت تیز استعمال کرو تاکہ اس کو ذبح ہوتے ہوئے کم سے کم تکلیف ہو۔

قرآن مجید میں نیکی کے لئے بِرّ کے علاوہ اور الفاظ بھی ہیں۔ مثلاً کہیں اسے خیر کہا گیا ہے کہیں معروف کا نام دیا گیا ہے۔

تو ثابت ہو گیا کہ اسلام کی رو سے نیکی کا مفہوم بہت وسیع اور ہمہ جہتی ہے اسی کا مطالبہ اپنے ماننے والوں سے یہ ہے کہ خود بھی نیک بنیں اور دوسروں کو بھی نیکی کی طرف راغب کریں

سوالات

۱۔ اسلامی تہذیب سے کیا مراد ہے اس کے بنیادی نظریات اور امتیازی اصولوں کی وضاحت کیجئے

۲۔ سب انبیاء اور رسول ایک ہی دین کی طرف دعوت دیتے رہے ہیں"!

اسلامی تہذیب کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

۳- اسلامی تہذیب کے عوامل اور عناصر پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

۴- اخلاقیات سے کیا مراد ہے اس لفظ کی تشریح کریئے اسلام کے نظریہ اخلاق پر مفصل بحث تحریر کریں۔

۵- اسلام میں نیکی کا مفہوم کیا ہے اور اس کی مختلف خصوصیات کیا ہیں۔ تفصیل سے درج کریں۔

باب (۴)

حقوق اللہ

اجزائے ایمان وارکانِ اسلام

دینِ فطرت یعنی اسلام کا سب سے اوّلین کام خالق اور مخلوق کے درمیان مضبوط تعلق کی استواری ہے۔ وہ یہ تعلق بخوبی پیدا کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس کے لوازم کیا ہیں، یہ تعلق بنیادی حیثیت رکھتا ہے تعلق باللہ سے دو امور مُراد ہیں پہلا اَمر ایمان اور دوسرے امر کا نام اسلام ہے۔

ایمان تصدیق قلب کا نام ہے یعنی کسی حقیقت کو خلوص دل سے ماننا ہر مذہب و ملت میں مخلوق کے خالق سے تعلقات کے چند اصول ہیں اسلام بھی بہترین اور پختہ اصول رکھتا ہے اور اپنے ماننے والوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ بھی چند ایسے حقائق کی تصدیق کریں جن کا تعلق کُلیتاً عالم غیب سے ہے اور اسی وجہ سے اس تصدیق یا ایمان کو ایمان بالغیب بھی کہا جاتا ہے۔ اور وہ حقائق اجزائے ایمان کہلاتے ہیں۔ ان کی تشریح ذیل میں مندرج ہے۔

۱۔ خدا پر ایمان۔ خدا کی ذات چونکہ آنکھوں سے پوشیدہ ہے اور حواس خمسہ انسانیہ اس کے ادراک پر قادر نہیں اس لئے اس پر ایمان لانا ایمان بالغیب کے زمرے میں آتا ہے یہ ہر مومن کا ایمان ہونا چاہئے کہ وہ ایسی ذات ہے جو سب پر حاکم ہے اس پر کسی کی حکومت نہیں وہ واحد یعنی اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں وہ قادر مطلق ہے ہر چیز پر اس کی گرفت ہے اس کی خدائی کی حدود متعین نہیں ہو سکتیں وہ لامکان ہے کوئی جگہ اسے گھیرنے کی طاقت نہیں رکھتی وہ سمیع ہے وہ بصیر ہے یعنی اس کی شنوائی اور نگاہوں سے کوئی بات پوشیدہ نہیں اس کے آگے سب خفیہ اور ظاہری چیزیں برابر ہیں۔ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اور باخبر ہے۔ پھر اس نے دُنیا کو چلانے کے

کچھ اصول بنا رکھے ہیں جنھیں اصول فطرت کہا جاتا ہے۔ ان اصولوں کے ماتحت ہر چیز اور ہر جسم اپنے اپنے کام میں لگا ہوا ہے کائنات کی تمام اشیاء پر اس کی حکومت ہے اور کائنات بھی اس کی ذات کی طرح لامحدود ہے وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اس کا کوئی ثانی نہیں نہ اسے کسی نے جنا نہ اس کی کوئی اولاد ہے۔ اس کی مانند کوئی اور ہستی ہے ہی نہیں اس لئے اس کی تشبیہہ نہیں دی جا سکتی۔ وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا وہ عادل ہے اور رحمان و رحیم بھی۔ اس کے حکم کے بغیر کوئی نہ کسی کا نقصان کر سکتا ہے نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ وہ قیامت کے دن کا مالک ہے۔ اس لئے اپنی تمام حاجتوں کے لئے اسی کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہیئے وہ خود کہتا ہے جب میرے بندے مجھ سے مانگتے ہیں تو میں ان کی پکار سنتا ہوں، اور ضرورت مندوں کی حاجتوں کو پورا کرتا ہوں۔ اس لئے ہر موقعہ پر اس سے ہر چیز مانگنا چاہیئے۔

۲۔ ایمان بالرسل۔ یعنی رسولوں پر ایمان لانا، ایمان کا دوسرا جزو ہے۔ یہ اس طرح ایمان بالغیب کے زمرے میں آتا ہے کہ جو رسول خدا کی طرف ہدایت دے کر بھیجے گئے تھے ان کے دعویٰ کو ماننا ضروری ہے اور چونکہ بغیر تامل یا تذبذب کے ان کی رسالتی حیثیت تسلیم کر لینے والے بڑے ہی نیک اور نیکی کے قبول کرنے والے اصحاب تھے اگرچہ انہوں نے رسول پر وحی نازل ہوتے نہیں دیکھی تھی اور صرف رسول کے کہنے ہی کو برحق مانا تھا گویا وہ غیب کی بات پر یقین کرنے والے تھے اس لئے ایمان بالرسل بھی ایمان بالغیب کے زمرے میں آتا ہے۔ یہ رسول خدا کی عطا کردہ وحی اور ہدایت کو عملاً اور قولاً جوں کی توں انسانوں تک پہنچانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ گویا یہ خدا اور بندے کے درمیان واسطہ کا کام دیتے ہیں۔ یہ خدا کی سنت ہے کہ وہ عام انسانوں سے براہ راست مخاطب نہیں ہوا کرتا، بلکہ وہ انہیں انسانوں میں سے برگزیدہ ترین اور قابل ترین اور صالح ترین انسانوں کو منتخب کر کے عام انسانوں کی ہدایت پر مامور کرتا ہے، یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو از خود نبی یا رسول نہیں بن جاتے بلکہ اللہ تعالےٰ انہیں اس منصب اعلیٰ پر فائز کرتے ہیں یہ ایک عطیہ خداوندی ہے کوئی آدمی از خود محنت یا عبادت یا ریاضت کر کے یہ مقام حاصل نہیں کر سکتا اور اس کے علاوہ یہ مقام صرف مردوں کا حق ہے عورتیں یہ منصب حاصل نہیں کر سکتیں ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ جتنے بھی انبیاء اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہدایت لیکر وقتاً فوقتاً آتے رہے ان سب پر ایمان لائے۔ سب سے پہلے پیغمبر یا رسول حضرت آدم علیہ السلام تھے جو سب سے پہلے انسان بھی تھے

اور ان ہی نسل سے تمام موجودہ عالم انسانیت وجود میں آئی ہے ان کے بعد نوحؑ پھر ہودؑ پھر صالحؑ پھر ابراہیمؑ پھر اسحٰقؑ اور اسمٰعیلؑ پھر یوسفؑ پھر موسیٰؑ پھر داؤدؑ پھر سلیمانؑ پھر عیسیٰؑ اور زکریاؑ یحییٰؑ اور ایوبؑ علیہم السلام اور ان سب کے بعد حضرت سید المرسلین خاتم النبیین محمدؐ مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔

۳۔ کتب سماویہ پر ایمان ۔ خدا کے رسولؐ جو پیغام خدا کی طرف سے لے کر انسانوں تک پہنچاتے تھے وہ صحیفوں اور کتابوں کی شکل میں ہوا کرتا تھا ہمارے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ صحیفوں اور کتابوں کو خدا کی طرف سے نازل شدہ سمجھیں کیونکہ خدا اور رسلؐ پر ایمان لانے کے ساتھ ہی یہ ضروری ہے کہ کتب سماویہ پر بھی ایمان لایا جائے۔ قرآن پاک میں جن آسمانی کتابوں کا مذکور ہے وہ یہ ہیں۔

۱۔ توراۃ ۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی۔

۲۔ زبور ۔ یہ حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل کی گئی۔

۳۔ انجیل ۔ یہ حضرت عیسٰی علیہ السلام پر نازل کی گئی۔

۴۔ قرآن مجید ۔ یہ حضرت رسول مقبول محمدؐ مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا۔ دُنیا میں آج کل صرف یہی ایک آسمانی کتاب ہے جو تحریف کرنے والوں کی دست بُرد سے محفوظ رہی گذشتہ امتوں پر جو بھی کتابیں نازل کی گئی ہیں ان میں بہت سی تبدیلیاں ہو چکی ہیں حتیٰ کہ وہ اپنی اصل شکل میں کسی آدمی یا فرقہ کے پاس بھی محفوظ نہیں لیکن قرآن پاک کے متعلق اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے اُس قرآن کو نازل فرمایا ہے۔ اور ہم خود ہی اس کے محافظ ہیں۔ اور تاریخ کی گواہی ہے اور اسے دشمن تک مانتے ہیں کہ جو کلام خدا کے حبیب حضور محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا بالکل وہی اور بعینہٖ وہی آج بھی اصل شکل میں موجود ہے۔ اس کے زیر زبر یا نقطہ تک میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یہ قرآن پاک کا زندہ معجزہ ہے۔ اور ہم مسلمانوں کا ایمان ہے کہ اسی طرح قیامت تک محفوظ اور زمانے کے لوگوں کے ہاتھوں سے ان کی دست بُرد سے صحیح سالم رہے گا۔

۴۔ فرشتوں پر ایمان ۔ فرشتے کو عربی میں مَلَک اور اس کی جمع کو ملائکہ کہتے ہیں ان پر ایمان لانا بھی ایمان کے اجزاء میں سے ہے۔ یہ نوری مخلوق ہیں اور خدا کے حکم کے طبعاً اور خلقتاً

یعنی پیدائشی طور پر مطیع و منقاد ہیں ان سے نافرمانی کا صدور ممکن ہی نہیں فرشتوں کو مختلف شعبے سپرد ہیں۔

۱۔ ایک فرشتے حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں جو سب سے مقرب ہیں اور جنہیں روح القدس بھی کہا جاتا ہے۔ ان کا کام یہ ہے کہ اللہ تعالٰے کی ہدایت اور وحی کو رسولوں کے پاس لیکر آئیں۔

۲۔ ایک فرشتے حضرت میکائیلؑ ہیں جو دُنیا میں تقسیم رزق پر مامور ہیں۔

۳۔ ایک فرشتے حضرت عزرائیلؑ ہیں جن کے ذمے لوگوں کی جانیں قبض کرنے کا کام ہے یہ موت کے فرشتے ہیں۔

۴۔ اور ایک حضرت اسرافیلؑ ہیں جنہیں قیامت کے موقعہ پر صور پھونکنے کا کام دیا گیا ہے جب قیامت برپا ہوگی تو حضرت اسرافیلؑ قرنا یا صور میں پھونک ماریں گے شروع میں اس کی آواز مدہم ہوگی، لیکن آہستہ آہستہ تیز سے تیز تر ہوتی جائے گی۔ حتّٰی کہ اس کی ہیبت سے سب لوگ اور جن و بشر و حیوانات مر جائیں گے۔ پھر وہ دوبارہ صور پھونکیں گے تو اس کی آواز سے تمام لوگ میدان حشر میں جمع ہو جائیں گے۔

۵۔ یوم آخرت پر ایمان ۔ خدائے تعالٰے مالک یوم الدین یعنی قیامت کے دن یا فیصلے کے دن کا مالک بھی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کی اس صفت پر ایمان لانے کے بعد ایک مسلمان کا قیامت کے دن پر ایمان بھی ہو، کیونکہ اللہ تعالٰے نے دُنیا میں کوئی چیز بھی بے مصرف نہیں بنائی اور انسان کو تو اس نے نہایت ذمہ دار مقام دیا ہے اور اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد دینوی اور اخروی فلاح و بہبود ہے۔ قرآن پاک میں خدا تعالٰے فرماتے ہیں کہ کیا لوگ خیال کرتے ہیں کہ ہم نے انسان کو محض بے کار اور بے مصرف اور بے مقصد بنایا ہے اور تم اس کی طرف یعنی اللہ کی طرف واپس نہیں لوٹو گے یعنی خُدا کے سامنے پیش نہ ہو گے۔ یہ قیامت کا تصور ہی ہے جو ذمہ داری اور ایمانداری اور نیک چلنی سکھاتا ہے اگر یہ تصور ختم ہو جائے تو ہر شخص من مانی کرے اس میں شک نہیں کہ آج کل مُنکرین بہت ہیں جو اپنے عمل سے ثابت کرتے رہتے ہیں کہ ان کا کوئی محاسبہ نہیں کیا جائیگا اور اپنی خواہشات کے مطابق ہر طرح کے ظلم و زیادتی اور کفر و عدوان کا ارتکاب کرتے ہیں یہ ٹھیک ہے کہ وہ

خدا کو نہیں دیکھ سکتے، لیکن انہیں یہ جرأت نہیں کہ خدا کا برملا انکار کریں وہ خدا کو اپنی مادی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے، لیکن کیا وہ موت کو بھی نہیں دیکھتے کیا ان کے سامنے لوگ مرتے نہیں کیا اس سے عبرت حاصل کرنے میں انہیں کوئی چیز مانع ہے۔ دراصل یہ بے ضمیر اور مادہ پرست انسان ننگ شرافت اور خدا کی زمین پر لعنت الہٰی کی زندہ تصویر ہیں۔ خدا فرماتا ہے کہ اے انسان میری پکڑ بڑی سخت ہے اب بھی ڈر جاؤ، خداوند کریم کی ذات تو اس قدر عظیم ہے کہ اس کا انکار ممکن ہی نہیں ہزار کوئی مادہ پرست اور منکر خدا ہو اس کی زندگی میں چند منٹ یا لمحے ضرور ایسے آتے ہیں کہ اس کے مادہ پرستانہ تصورات اس کی نگاہ میں بالکل بے حقیقت ہو جاتے ہیں اور وہ پکار اٹھتا ہے کہ اتنی بڑی کائنات کا پیدا کرنے والا نہ چلانے والا ضرور کوئی ہے اور یہ کہ انسانی زندگی بے مصرف اور بے مقصد نہیں پنڈت نہرو جو مادہ پرستوں کا سردار اور بالکل منکر خدا تھا وہ بھی ایک موقعہ پر کہنا پڑا تھا کہ ہمارے افسروں میں جب تک خدا کا خوف نہ ہوگا حکومت کا انتظام درست نہیں ہو سکتا۔ تو جس طرح خدا کا انکار ممکن نہیں یہ بھی ممکن نہیں کہ اس کے محاسبہ کے تصور سے بے نیاز ہو جائے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ جو مرگیا سمجھو کہ اسکی قیامت آگئی تو ہر انسان کے سامنے ہر روز یا ہر ہفتہ یا مہینے میں متعدد موقعوں پر قیامت صغریٰ یعنی انسانوں کی موت واقع ہوتی ہے لہٰذا اسی ایک بات سے اگر عبرت پکڑی جائے تو انسان کسی پر ظلم کرے، اور نہ ہی خدا کے غضب کو دعوت دے اور اپنے ہر اقدام پر نہایت ذمہ داری اور جوابدہی کا تصور قائم کرے کہ روز قیامت سے ڈرے اور کبھی ظلم و عدوان یا سرکشی کا راستہ اختیار نہ کرے اور حقیقت میں یہی انسان صحیح معنوں میں انسان کہلانے کا مستحق ہوگا۔

ارکان اسلام

اسلام کے لغوی معنی سپردگی اور گردن جھکا دینے ہیں۔ اسلام قبول کرکے بندہ اپنی ذات کو اللہ تعالےٰ کے آگے جھکا دیتا ہے اور اطاعت خداوندی اور اطاعت رسولؐ اپنے اوپر لازم قرار دے دیتا ہے۔ یہ لفظ اپنا وسیع مفہوم بھی رکھتا ہے اور اس وسعت میں وہ ایمان کو بھی اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ لیکن جب ایمان کے ساتھ اسلام کا لفظ استعمال کیا جائے تو اس کے معنی میں تقیید اور محدودیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس سے مراد وہ اعمال ہیں جن سے ایک مسلمان اس کا پابند ہے کہ مکمل کر

اور اعلان کر کے ان پر عمل پیرا ہو۔ یہ پانچ ارکان پر مشتمل ہے۔

۱۔ کلمہ شہادت لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی گواہی دینا یا علان کرنا اسلام کے ارکان میں سے ہے۔ یہ ایک طرح کی اظہار وفاداری ہے جو ایک مسلمان اللہ اور اُس کے رسولؐ کی تابع داری کرتے ہوئے کرتا ہے۔ اس کے اعلان سے وہ ایک عظیم برادری کا رکن تصور ہوگا جو دُنیا اور آخرت میں بہترین ہے۔ پھر اس پر اسلام کے حقوق و فرائض عائد ہوں گے یعنی وہ ان تمام مراعات کا حق دار ہوگا جو اسلام قبول کر کے اسے ملتی ہیں اور ان تمام فرائض پر کاربند ہونا اس کے لئے لازمی ہوگا جو بحیثیت ایک مسلمان کے اس پر ضروری ہیں۔

۲۔ نماز :- یہ اسلام کا دوسرا اہم ترین رُکن ہے۔ اس کے لئے قرآن مجید میں تاکید آئی ہے بار بار اقیموا الصلوٰۃ (یعنی نماز قائم کرو) کے الفاظ قرآن میں کئی مقامات پر آتے ہیں۔ یہ ہر عاقل بالغ مسلمان پر فرض ہے یہ دن میں پانچ دفعہ پڑھی جاتی ہے اور جس طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا کی ہے اس کی تفصیل احادیث میں کثرت سے موجود ہے۔ قرآن میں اس کا فلسفہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ نماز فسق و فجور اور بے حیائی سے روکتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ نماز قائم کرو اور مشرک نہ ہو یعنی ترک نماز ایک طرح کا شرک ہے اس طرح نماز کی مداومت سے قوم کے اخلاق حسنہ قائم ہوتے ہیں اور یہ ایک بے مثل اور مثالی اُمت بن جاتی ہے۔

۳۔ روزہ :- عربی میں اسے صوم کہتے ہیں اور اس کی جمع صیام ہے اس کا مطلب خاموش رہنا ہے۔ یہ اسلام کا تیسرا رُکن ہے اس کی ادائیگی کا طریقہ یہ ہے کہ صبح صادق سے لیکر شام کو غروب آفتاب تک کسی قسم کا کھانا پینا یا چکھنا یا کوئی چیز حلق سے اُتارنا منع ہے۔ اور جہاں تک صوم کے لفظی معنوں کا تعلق ہے اس عبادت کے اندر بھی ایک طرح کا سکوت اندر ایک طرح کی خاموشی موجود ہے بیہودگی ویسے بھی بری بات ہے اس عبادت کے دوران بیہودہ گوئی کی شدید مذمت کی گئی ہے قرآن پاک میں آیا ہے کہ روزے تم پر اسی لئے فرض کئے گئے کہ تم پرہیزگار بنو کھانے پینے اور عورت سے نزدیکی سے مجتنب رہنے سے انسان کے اندر ضبط نفس کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اس کے علاوہ اسے دوسرے محتاجوں

کی حالت کا اندازہ لگتا ہے یہ اخلاقی اور روحانی تربیت ہے جو ایک بہترین اُمت کے لئے ایک مہینہ کے لئے فرض قرار دی گئی ہے تاکہ اس اُمت کے اندر اخلاق حسنہ اور ایثار و قربانی کے جذبات ابھریں اور اس طرح وہ دُنیا کی دوسری قوموں کے لئے نمونہ نہیں۔

۴۔ حج :- یہ اسلام کا چوتھا رکن ہے اس عبادت کو اس طرح کیا جاتا ہے کہ ہر سال ایک وقت مقررہ پر تمام دُنیا کے مسلمانوں کے نمائندے یا صاحب استطاعت لوگ خانہ کعبہ کے گرد جمع ہو کر اس کے گرد گردش کرتے رہیں۔ حج ذوالحجہ کے مہینہ میں ادا کیا جاتا ہے اور اس مہینہ کی سات تاریخ سے لیکر بارہ تاریخ تک اس کے مناسک یا رسوم ادا کئے جاتے ہیں، ہر ایسے آدمی پر حج فرض ہے جو اتنی طاقت رکھتا ہو کہ راستے میں اور حجاز مقدس میں قیام کے دوران ان کے اخراجات کا بخوبی بوجھ اٹھا سکے اور اس کے علاوہ اپنے اہل و عیال اور متعلقین کے لئے بھی گذارہ کا بخوبی بندوبست کر سکے۔ حج کی تاریخوں سے پہلے یا بعد میں ہر حاجی کے لئے لازم ہے کہ حضورؐ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس واقعہ مدینہ منورہ کی زیارت بھی کرے اور مسجد نبوی میں کم از کم چالیس نمازیں ادا کرے، یہ زیارت اگرچہ حج کا رکن تو نہیں اس کے بغیر بھی حج ادا تو ہو جاتا ہے لیکن حبِ نبوی کے تقاضے پورے نہیں ہوتے کیونکہ کسی سچے مسلمان کا دل ہی نہیں مانتا کہ اتنی دور سے حج کا فریضہ ادا کر لے جائے اور حضور کے دربار میں حاضری نہ دے۔ ہر استطاعت رکھنے والے پر عمر میں ایک دفعہ حج فرض ہے۔ حج کے اجتماع میں اسقدر فوائد اور مصلحتیں پنہاں ہیں کہ بیان سے باہر ہیں تمام دُنیا کے مسلمانوں کا عظیم اجتماع ویسے بھی ایک روح پرور نظارہ ہے پھر اس کا اصل مقصد عالم اسلام کے پیچیدہ مسائل اور مشکلات کا حل ہے جس کے لئے تمام اہل اسلام پر لازم ہے کہ اکٹھے ہو کر اُن کا حل سوچیں اور کوئی نہ کوئی نتیجہ خیز بات طے کریں، مثال کے طور پر اس وقت مسلمانوں کا قبلۂ اوّل یعنی بیت المقدس یہودیوں کے جبریانہ پنجہ میں ہے۔ یہ تمام اہل اسلام کا فرض ہے کہ یہودیوں کو اس شہر مقدس سے خارج کرنے کی تدابیر سوچیں نہ صرف سوچیں بلکہ اس موقعہ پر اور ایسے نازک وقت پر کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کریں۔ ان اجتماعی فوائد کے علاوہ انفرادی طور پر بھی فریضۂ حج بہت سے فوائد رکھتا ہے حضورؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ جس کسی نے

خلوص کے ساتھ حج کیا اور مناسک حج با حسن طریق انجام دیئے وہ گویا ماں کے پیٹ سے اس وقت پیدا ہوا۔ یعنی اس کے تمام گذشتہ گناہ معاف ہو گئے۔

۵۔ زکوٰۃ :۔ اللہ کے عطا کردہ مال میں سے ڈھائی فیصدی کے حساب سے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کے لئے نکالنا اور محتاجوں وغیرہ کو دینا زکوٰۃ کہلاتا ہے۔ یہ خدائی ٹیکس ہر سال ادا کرنا ضروری ہے۔ تمام فرائض اسلام میں سے زکوٰۃ سب سے آخر میں فرض ہوئی۔ اور حضورؐ نبی کریم نے اپنی عمر کے آخری سال میں اس بات کا اہتمام کیا کہ مختلف علاقوں میں زکوٰۃ وصول کرنے والے آدمی بھیجے جو حساب کر کے لوگوں سے زکوٰۃ کا مال اکٹھا کر کے وہیں کے محتاجوں وغیرہ میں تقسیم کر دیتے تھے اور جو بچ رہتا تھا حضورؐ کے پاس لے آتے تاکہ اسلامی ریاست کے رفاہ عامہ کے لئے خرچ کیا جائے۔ یا اگر اس وقت فوری ضرورت نہ ہوتی تو مرکزی بیت المال میں جمع کر دیا جاتا اور ضرورت کے وقت خرچ کیا جاتا۔ زکوٰۃ کی رقم میں مختلف حیثیتوں میں شرح میں کچھ اختلاف ہے یعنی مال تجارت اور بھیڑ بکریوں گائے بھینس یا اونٹ گھوڑے وغیرہ میں الگ الگ شرح میں مقرر ہیں جو فقہ کی کتابوں میں تفصیل سے درج ہیں۔

زکوٰۃ مسلمانوں کے افلاس کا علاج اور معاشی استحکام کا ذریعہ ہے اگر اس نظام کو پوری طرح جاری وساری کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ کوئی نادار یا غریب یا حاجت مند ہم میں نظر آئے۔

اس کی اہمیت اور اسلام میں اس کا مقام سمجھنے کے لئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت کی مثال سامنے رکھیں، جب عرب کے مختلف قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا تو آپؓ نے نہایت سختی اور مضبوطی سے ان سے زکوٰۃ ادا کرنے کا مطالبہ کیا اس وقت ابھی آفتاب رسالت کے غروب ہونے پر زیادہ وقت نہ گذرا تھا کہ عرب کے مختلف قبائل میں ارتداد اور منکرین زکوٰۃ نے نئے نئے فتنے برپا کر دئے۔ آنحضرتؐ کی ذات کی عظمت کے پیش نظر جو قبائل آپ سے مرعوب تھے انھوں نے خیال کیا کہ محمد تو فوت ہو گئے اب ہم جو چاہیں کریں لیکن صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی فراست اور تدبر اور علو ہمتی نے ان مسائل کا حل کر لیا آپ نے سختی سے ارکان اسلام پر عمل کرانے کا تہیہ کر لیا اور منکرین زکوٰۃ کو معلوم ہو گیا کہ نبوت کا رعب ابھی قائم ہے کیوں کہ نبیؐ کے جانشین

بھی انھیں کے غلام اور نام لیوا ہیں اور اسلام کے احکام جاری کرنے میں نرمی کی توقع ان سے نہیں ہو سکتی اس طرح یہ فتنے آہستہ آہستہ دب گئے مانعین زکوٰۃ نے زکوٰۃ ادا کرنی شروع کر دی اور مرتدین راہِ راست پر آگئے۔

اس واقعہ سے زکوٰۃ کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت امیر المومنین ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تارکین زکوٰۃ کو تارکین اسلام قرار دیا اور ان سے جہاد کا عزم کیا۔

اہم سوالات

۱- ایمان کی تعریف کریں۔ نیز بتائیں کہ ایمان اور اسلام میں کیا فرق ہے۔
۲- اجزائے ایمان پر مختصر الفاظ میں تشریحی مضمون لکھیں۔
۳- ارکان اسلام کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں ان میں کلمہ طیبہ کی کیا حیثیت اور کس نوعیت کی اہمیت ہے، واضح کریں۔
۴- نماز کی اہمیت اور فوائد پر ایک چھوٹا سا مضمون تحریر کریں۔
۵- زکوٰۃ کو اسلام کے معاشرتی نظام میں کس طرح کا [illegible] ملی ہے۔ اس کی اہمیت اور معاشرتی فوائد پر ایک مختصر مضمون لکھیں۔
۶- روزہ ایک مسلم کی زندگی پر کس طرح کا اثر ڈالتا ہے مختصر [illegible] مون میں وضاحت کریں۔
۷- حج کے اقتصادی اور بین الاسلامی اثرات پر ایک مختصر مضمون [illegible]

انفرادی زندگی

فرد یعنی نفس واحد کے حقوق و فرائض

اس سے مراد ایک شخص کی انفرادی اور شخصی زندگی ہے۔ یعنی ایک آدمی اپنے آپ میں کیسا ہے اس کی شخصیت کس نوعیت کی ہے اور اسے کس طریق پر کاربند ہونا سودمند ہے کون کون سی بات اس کے لئے اختیار کرنے کی ہے جسے وہ چھوڑ دیتا ہے اور کون کونسی چیز اسے چھوڑنی چاہئے جسے وہ اختیار کرتا ہے۔

فرد کی بہتری اور صلاحیت سے قوم اور معاشرہ کی بہتری اور صالحیت یا صلاحیت کی تعمیر ہوتی ہے اگر کسی قوم کے افراد ہی غلط رو اور گمراہ ہیں ان کے سامنے زندگی کا کوئی واضح نصب العین نہیں تو وہ قوم مجموعی طور پر قابلِ نفرین ہے اس قوم کی اصلاح ہونی ضروری ہے ورنہ اس کا انجام دردناک ہوگا۔

انفرادی زندگی میں جو ذمہ داریاں ایک مسلم پر آتی ہیں اور جو کام اسے اختیار کرنے لازمی ہیں ان تمام کی رہنمائی ہم کو قرآن پاک اور سنت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں ملتی ہے اب اسی روشنی کی مدد سے مندرجہ ذیل عنوانات پر بحث ہوگی وہ عنوانات یہ ہیں۔

تقویٰ۔ ذکر۔ شکر۔ صبر۔ عفو۔ عدل۔ احسان اور خدمتِ خلق

باب (۵)

تقویٰ

تقویٰ کا مقام اسلام میں بہت بلند ہے اس کے معنی بچنے یا بچانے کے ہیں یعنی اپنے آپ کو ان باتوں سے بچانا جن سے خدا تعالےٰ ناراض ہوں اور اسی کا نام پرہیزگاری اور گناہ سے بچنے کی ہیں۔ چنانچہ سورہ بقر کے شروع میں ارشاد خداوندی ہے کہ یہ کتاب یعنی قرآن پاک پرہیزگاروں کے لئے ہدایت کا سرچشمہ ہے اسلام کی تعلیم کی رو سے تقویٰ شعاری ہی عزت کا راستہ ہے ارشاد ربانی ہے کہ اے انسان ہم نے تم سب کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا لیکن خدا کے نزدیک تم میں سے معزز اور قابل قدر وہی ہے جو سب سے بڑھ کر تقویٰ اختیار کرنے والا ہے۔ یہ قبیلہ اور قوم اور خاندان عزت کا معیار نہیں بلکہ پرہیزگاری اور تقویٰ عزت کا معیار ہے۔ ۱

حدیث نبویؐ کی رو سے تقویٰ کی تعریف حضورؐ نے یہ کی ہے کہ اگر کوئی ایسے جنگل یا وادی سے گزرے جہاں خاردار جھاڑیاں بکثرت ہوں تو جس طرح وہ اچھی طرح احتیاط سے اپنا لباس سمیٹ کر کانٹوں اور جھاڑیوں سے بچتا ہوا اپنی حفاظت کا خیال رکھتا ہوا گذرتا ہے بالکل یہی حال متقی کا ہے وہ خارزار گناہ سے اپنا دامن حتی الامکان بچاتا ہے اور کبھی گناہ اور معصیت میں مبتلا ہونے کی کوشش نہیں کرتا۔ آپ نے ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ مشکوک اور مبہم اشیاء سے بھی پرہیز کرنا ایک متقی کی علامت ہے یعنی جب کسی چیز کے استعمال کے متعلق حلال و حرام دونوں کا احتمال ہے تو بھی اس سے پرہیز لازم ہے۔

اور تقویٰ کے برعکس معنی میں لفظ عدوان ہے اس کے معنی حد سے بڑھنے اور سرکشی اختیار کرنے کے ہیں' تو اس سے ثابت ہوا کہ متقی اللہ کی مقرر کردہ حدود سے کبھی تجاوز

نہیں کرتا۔ اور سرکشی بالکل اختیار نہیں کرتا وہ ہر معاملہ میں اللہ کے مقرر کردہ احکام و حدود کا لحاظ رکھتا ہے۔ اہمیت۔ تقویٰ تمام حسنات یعنی نیک عادات کی روح ہے۔ اللہ تعالیٰ نیکی اور نیک کی تعریف کرنے کے بعد فرماتے ہیں وَاُولٰئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ :۔ یعنی یہی لوگ متقی ہیں۔
یہ تمام عبادات کا حاصل اور ثمرہ ہے ماہ صیام کے روزوں کی فرضیت بیان کرتے ہوئے ارشاد ربانی ہے کہ روزے تم پر اسی لئے فرض کئے گئے کہ تم متقی ہو۔

قرآن پاک میں تقویٰ اختیار کرنے کی متعدد مقامات پر نہایت زوردار الفاظ میں تاکید کی ہے اتقو اللّٰہ کا لفظ بیسیوں دفعہ کلام الٰہی میں وارد ہوا ہے اور فرمایا کہ بیشک اللہ متقیوں کو دوست رکھتا ہے۔

ایک موقعہ پر چند منافق لوگ حضورؐ کے پاس آئے اور عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے فلاں مقام پر مسجد بنائی ہے آپ وہاں تشریف لاکر نماز پڑھائیں تاکہ دوسرے لوگ اس مسجد کی طرف متوجہ ہوں اور اس کی رونق میں اضافہ ہو حضورؐ ابھی غور کر ہی رہے تھے کہ وحی الٰہی کے ذریعے آپ کو مطلع کر دیا گیا کہ یہ لوگ منافق ہیں ان لوگوں نے محض مسلمانوں کے اندر تفرقہ ڈالنے کے لئے اس مسجد کا ڈھونگ کھڑا کیا ہے۔ آپ اس میں ہرگز نماز نہ پڑھیں اس مسجد کا نام قرآن پاک میں مسجد ضرار آیا ہے یعنی مصیبت کا پیش خیمہ۔ بلکہ اس کے مقابلے میں وہ مسجد جسے متقیوں اور خلوص سے اطاعت خدا و رسولؐ کرنے والوں نے تعمیر کیا ہے اس میں آپ زیادہ حق رکھتے ہیں کہ نماز ادا کریں۔ مورخین کے نزدیک اس مسجد کا نام مسجد قبا تھا جس کے بانی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے جانثار پکے مومن متقی اور سچے مسلم تھے جو مدینہ منورہ کی ایک بستی میں بنائی گئی تھی۔ اس واقعہ سے ثابت ہوا کہ تقویٰ کے مقابلہ میں نفاق اور تفرقہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے تقویٰ اور پرہیز گاری مسلمانوں کے اتحاد اور سالمیت کے نشان ہیں۔

فلاح و کامرانی کے لئے بھی تقویٰ شرط ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔ اِتَّقُو اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ اللہ سے ڈرو تاکہ تم دین و دنیا میں بامراد اور فلاح پانے والوں میں شمار ہو سکو۔ گناہوں کے عقاب اور سزا سے رہائی بھی اور مغفرت و بخشش کے دروازے بھی تقویٰ سے ہی

کھلتے ہیں۔

فرمایا۔ وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهِ وَيُعْظِمْ لَهُ أَجْرًا جو کوئی اللہ سے ڈرتا ہے وہ اُس کی بُرائیاں اس سے ہٹا دیتا ہے اور اس کے لئے اجر بڑھاتا ہے۔

لباس انسان کی شخصیت کے امتیاز کو اُجاگر کرنے والی چیز ہے اور اس سے کئی طرح کے مقاصد ظاہری کی تکمیل ہوتی ہے لیکن خدا کے نزدیک لباس کے معاملہ میں تقویٰ شعاری ایک مسلمان کا طرۂ امتیاز ہے۔

فرمایا۔ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ یعنی تقویٰ اور پرہیزگاری کا لباس ہی بہترین لباس ہے اسی لئے لباس کے معاملہ میں حج کے مواقع پر احرام کی صورت میں یک رنگی کا اہتمام کیا گیا ہے تاکہ تمام اقوام اپنے اپنے مخصوص قومی لباسوں کی خوبیوں اور بہتری کے خیالات چھوڑ کر ایک ہی لباس میں ملبوس ہوں اور چھوٹے بڑے رئیس و غلام اور کمتر و برتر کی تمیز نہ رہے۔ پھر لباس ہی نہیں خوراک کے معاملہ میں بھی تقویٰ اور پرہیزگاری کو شرف بخشا گیا!

مسافر کے لئے سامان سفر میں خوراک سواری اور زاد راہ کے ساتھ ساتھ فرمایا کہ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۔ سفر کا سامان اکٹھا کرو اور بہترین سفر کا سامان تقویٰ کا سامان ہے۔

اہلِ اسلام کو مخاطب کر کے یہ بھی فرمایا کہ اے مومنو تم سے پہلی اُمتوں پر بھی تقویٰ ضروری قرار دیا گیا تھا۔ اور تم پر بھی وہی احکام نازل کئے گئے اور تقویٰ کی تاکید کی گئی ہے۔ عدل کی صفت کا تعلق بھی تقویٰ سے ہے ارشادِ خداوندی ہے اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۔ یعنی اے اہلِ اسلام عدل کیا کرو کیونکہ یہ صفت تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔ اور تقویٰ اختیار کرو۔

فضیلت :-

کسی چیز کی فضیلت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ کسی حد تک انسان کی سعادت کا باعث بنتا ہے۔ اور انسانی سعادت اپنے مولا کریم اور خالق و مالک کے قرب میں ہے۔ تو ہر وہ

چیز جو اس معاملہ انسان کی مدد کرے وہ صاحبِ فضیلت ہے اور خوفِ خدا اس قربِ الٰہی کے مقصد میں بہت بڑا معاون و مددگار ہے۔ اور تقویٰ اس کے ثمرات میں سے ہے۔ اس سے اس کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔

حضور نے تقویٰ کی فضیلت کے متعلق فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ پہلوں اور پچھلوں کو قیامت کے دن جمع کرے گا۔ تو اچانک ایک آواز آئے گی۔ جسے سب لوگ سُن لیں گے۔ اللہ تعالیٰ جلّ وعلیٰ فرمائینگے۔ "اے انسانو جب سے میں نے تم کو پیدا کیا اس وقت سے میں نے تم سے کلام نہیں کیا' آج تم میرے سامنے خاموش رہو' یہ تمہارے اعمال ہی ہیں جو تم کو واپس لوٹائے جا رہے ہیں۔ اے انسانو میں نے بھی ایک نسب بنایا اور تم نے بھی نسب بنائے۔ پس تم نے میرے بنائے ہوئے نسب کو گرا دیا اور اپنے اپنے نسبوں کو بلند رکھا میں نے کہا تھا کہ تم میں سے میرے نزدیک زیادہ معزز وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے اور تم نے اس کا انکار کر دیا۔ تم نے کہنا شروع کر دیا۔ فلاں ابن فلاں وغیرہ پس میں آج تمہارے نسب کو گراتا ہوں اور اپنے نسب کو بلند کرتا ہوں۔ پس اہلِ تقویٰ کہاں ہیں؟ پس ان کے لئے ایک جھنڈا بلند کر دیا جائے گا۔ اور وہ اس کے پیچھے چل کر جنت میں بغیر حساب و کتاب اپنے اپنے گھروں میں داخل ہو جائیں گے۔

حضورؐ کا ارشاد ہے اصل دانائی خدا کا خوف ہے۔

اور ایک اور ارشاد ہے کہ متقی خدا کا محبوب ہے۔

متقین کی صفات۔

تقویٰ انسان کے اندر ایسے اخلاق و عادات پیدا کر دیتا ہے کہ نیک کام خود بخود اس سے ظہور پذیر ہونے شروع ہو جاتے ہیں یعنی اس سے بیساختہ نیک ہی کام سرزد ہوتے ہیں چنانچہ مندرجہ صفات کا ظہور دائمی طور پر اس کی ذات کا فعل ہے۔ حقوق اللہ کی ادائیگی یعنی ایمان اور اسلام کے اصولوں پر سختی سے قائم رہنا اس کا شیوہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے عقائد بھی دُرست رکھتا ہے اور فرائض سے بھی بخوبی عہدہ برا ہوتا ہے۔

پھر وہ حقوقِ نفس سے بھی غافل نہیں رہتا۔ حدیث میں ہے اِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا کہ تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی قدر و قیمت کو خوب سمجھتا ہے وہ حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھتا ہے اور اپنی نفسانی حدود

سے تجاوز نہیں کرتا۔ اور وہ مشتبہ امور سے بھی پرہیز کرتا ہے۔

حقوق العباد :- وہ عہد کو پورا کرتا ہے عدل کو اختیار کرتا ہے خواہ اس میں اِسکا اور اس کے عزیزوں کا نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ کسی کی حق تلفی کے قریب بھی نہیں جاتا۔ یعنی جتنے بھی حقوق اس کے ذمے اللہ کے بندوں کے ہیں وہ ان کو اچھی طرح سمجھتا ہی نہیں بلکہ ان کے ادا کرنے پر ہر وقت تیار اور آمادہ رہتا ہے۔

نتیجہ۔

قرآنِ پاک میں ارشادِ خداوندی ہے۔

وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۔ یعنی انجام صرف متقی لوگوں کا ہی خیر و برکت والا ہے۔ دُنیا اور آخرت دونوں ہی سُرخروئی اور فلاح صرف متقی اور پرہیزگار لوگوں کا ہی حصّہ ہے۔

باب (۶)

ذکر

مطلب :- عربی میں ذکر کے معنی یاد کرنے کے ہیں اور اس لفظ ذکر سے مُراد یادِ الہٰی اور ذکر الہٰی ہے۔ اس کے برعکس الفاظ غفلت اور نسیان ہیں یعنی مطلب یہ ہوا کہ ذکر الہٰی کرنے والے مُسلم اور مومن ہیں، اور جو ذکر الہٰی نہیں کرتے انہیں غافل اور بھولنے والے کا لقب دیا گیا ہے۔ یہ لوگ بھول میں پڑے ہوتے ہیں کہ ذکر اور عبادت جیسے فرائض سے کوتاہی کے مرتکب ہوتے ہیں، وہ یہ بھول بیٹھے ہیں کہ ہم کو ہمارے خالق نے دُنیا میں پیدا کر کے خاص مقصد کے لئے بھیجا ہے اور ہماری زندگی کا ایک خاص نصب العین اور ایک مناسب رُخ ہے۔ اصل میں عبادت ہی ایک بندے اور معبود کے درمیان واسطہ اور تعلّق قائم کرنے کا بہترین اور پسندیدہ طریقہ ہے۔ اور بندے کے لئے چارہ ہی نہیں کہ اپنے خالق کو یاد کرنے میں پورے کا پورا منہمک رہے۔

قرآن پاک میں قرآن کو بھی ذکر کے نام سے پکارا گیا ہے فرمایا اِنْ ھُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ ۔ یعنی قرآن پاک اور کچھ نہیں مگر ذکر ہے تمام دُنیا کے لئے۔

اِس کا مطلب یہ ہوا کہ جس طرح کا ذکر الہٰی قرآنِ مجید کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے اور جو طریقہ ذکر و عبادت قرآنِ کریم میں آیا ہے صرف اس طرح یادِ الہٰی اور ذکر الہٰی اور عبادت الہٰی کی جانی چاہیئے، اس میں ذکر قلبی بھی اور ذکر لسانی بھی اور ذکر جہری بھی آجاتے ہیں۔ جب کوئی انسان زور سے اور جوش سے ذکر کرتا ہے تو اس عشق اور جوش میں ہر طرح کا ذکر پنہاں ہے۔ لیکن قرآن پاک میں ذکر خفی اور قلبی پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور مدھم آواز میں ذکر کرنے کی فضیلت زیادہ ہے ذکرِ خفی کو ذکر قلبی بھی کہتے ہیں اور ذکرِ لسانی کو ذکر

جہری یا ذکر بالجہر کہا جاتا ہے، دونوں صورتوں میں توجہ اور تفکر لازمی ہے توجہ اور سوچ کے بغیر ذکر میں خلوص نہیں ہوتا اور یہ عبادت اکارت جاتی ہے، بہرحال ذکر خفی یا قلبی ذکر ہو یا جہری اور لسانی دونوں صورتیں جائز ہیں موقعہ ومحل کے لحاظ سے کوئی صورت بھی اختیار کی جا سکتی ہے ماحول کو مدنظر رکھتے ہوئے صورت میں تبدیلی کی جا سکتی ہے لیکن بالکل کورے اور بے دین ماحول میں ذکر جہر اور ذکر لسانی یعنی بلند آواز میں ذکر کرنا زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔

اس مادی اور کافر ماحول میں تو مجلس ذکر کا کسی کو علم ہی نہیں ہے پہلے اوقات میں صوفیا عظام اور مشائخ کرام نے متعدد حلقے بنائے ہوئے تھے جن میں ذکر الہٰی مل جل کر اور اکٹھے ہو کر کیا کرتے تھے۔ ان کو مجالس ذکر الہٰی کا نام دیا جاتا تھا۔ ان میں عموماً درود شریف اور لا الٰہ الا اللہ کا ذکر جہری ہوا کرتا تھا اس ذکر کی مجلس میں جب کثرت سے اور پوری قوت سے کچھ دیر میں یہ مجلس گرم ہو جایا کرتی تھی تو عموماً حلقے کے شرکاء اٹھ کھڑے ہوتے تھے اور مجلس میں اور زیادہ جذبات عشق کی فراوانی ہو جاتی تھی پھر بعض اوقات یہ جذبات عشق رقص کی صورت میں بھی ظاہر ہو جاتے تھے کہ کوئی درویش یا صوفی ذکر الہٰی کی ضربوں سے اتنا متاثر ہو جاتا تھا کہ ناچنے لگتا تھا۔ یہ مجالس عموماً خانقاہوں یا زاویوں میں منعقد ہوتی تھیں۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے۔ اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔

وہ لوگ جو اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے ہو کر بیٹھ کر اور پہلوؤں پر لیٹ کر اور غور کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے بارے میں۔

مشائخ کے نزدیک ذکر خفی یا قلبی کے دوران میں دنیوی اور مادی واسطہ بھی دور ہو جاتا ہے اس طرح بندہ اپنے مولیٰ کے قرب کی لذت اپنے دل کی گہرائیوں میں اچھی طرح محسوس کرتا ہے۔ اس کیفیت ومستی میں ایک ایسی لذت اور سرور ہوتا ہے اور دل پر اس طرح کی واردات ہوتی ہیں کہ ذکر کرنے والا ہی اسے محسوس کر سکتا ہے۔ صوفیا فرماتے ہیں کہ ایسی کیفیت کا دوام شرط ہے یعنی دل کو ہر وقت اس طرح کی وارداتوں کا شکار اور ہدف بنے رہنا چاہیے تاکہ بندہ

ہر وقت حضوری کا لطف لیتا رہے، ان کا قول ہے جو دم غافل سو دم کافر یعنی ہر سانس کو ذکرِ الٰہی سے معمور ہونا ضروری ہے اور جو سانس بھی اس کے بغیر گذرے گویا وہ کفر کی حالت میں گذرا۔ اُوپر کی آیتِ مقدسہ میں ذکر کی دوامی کیفیت کی طرف اشارہ ہے یعنی انسان خواہ بیٹھا ہے خواہ کھڑا ہے خواہ لیٹا ہے اسے ہر وقت ذکرِ الٰہی میں مستغرق ہونا ضروری ہے۔

احادیث کی رو سے ذکر کے لئے بہترین الفاظ اور جامع الفاظ مندرجہ ذیل ہیں لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰه، سُبْحَانَ اللّٰه، اَلْحَمْدُ لِلّٰه، اللّٰهُ اَكْبَر

اس قسم کے حلقہ ہائے ذکر اگر اجتماعی ہوں اور ذکرِ جہر یعنی بلند آواز سے ذکرِ الٰہی کیا جائے تو یہ بہت متاثر کرنے والا ہوتا ہے اور اکثر ایسی مجالس ہائے ذکر مسجدِ نبوی میں بھی قائم تھیں۔ اس طرح کے ذکر سے اللہ تعالیٰ کی رحمتیں و انوار اپنے بندوں پر نازل ہوتے ہیں۔

اثرات ونتائج

قرآنِ پاک میں ارشادِ خداوندی ہے

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ

آگاہ رہو کہ صرف ذکرِ الٰہی سے ہی دلوں میں تسکین اور اطمینان ہوتا ہے۔

مادی ماحول میں بھی اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ جو خدا کی یاد سے غافل ہیں ان کے دلوں میں تسکین کا کوئی سامان نہیں وہ ایک بے چینی اور خلا سا اپنی زندگی میں محسوس کرتے ہیں اس کی یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے خالق کو بھولے ہوئے ہیں اور خالق انہیں بھول گیا ہے خدا تو علیم و خبیر ہے اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں پھر وہ کس طرح بھول سکتا ہے۔ اس سوال کا جواب عقل سے نہیں بلکہ محسوسات سے دینا ہوگا۔ انسان کو خدا نے بھلایا نہیں لیکن غافل اور خدا کو بھولنے والے سے دل کا اطمینان اور تسکین چھین کر اُسے آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے یہی خدا کا "بھولنا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ فِیْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ - وہ اپنی سرکشی کے عالم میں اور بغاوت کی کیفیت میں مبتلا ہیں ان کو خدا اور خالق کی طرف ذرا دھیان نہیں اور اسی سرکشی میں وہ غوطے کھا رہے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر بھٹکتے پھرتے ہیں اور اپنی زندگی کے

مقصد اور نصب العین کا پتہ ہی نہیں۔

یہ ہے ذکر الہٰی سے خالی ہونے کا انجام۔

تسکین قلب سے عاری انسان کا مال و دولت اور اقتدار یا منصب اس کے کسی کام نہیں آتا وہ ایسی دولت سے محروم ہے جو انسانیت کی تکمیل اور شرف و علو مرتبت کے حصول میں اس کے دل کو برقرار اور مضبوط رکھ سکتی تھی۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ مجاہدین اسلام اللہ کے ارشاد کے مطابق جب کثرت سے ذکر الہٰی کیا کرتے تھے تو کامیابی ان کے قدم چومتی تھی۔ پھر ذکر الہٰی کرنے والا مومن خالق کے علاوہ مخلوق کی نظر میں بھی محبوب در نیک نام ہوتا ہے وہ خلائق کا پسندیدہ ہوتا ہے اور جہاں جاتا ہے عزت و مرتبت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ دنیا میں یہ انعام اسی وجہ سے ہے کہ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے۔

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ

تم میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر کروں گا۔ سچ ہے جو اللہ کا ہو گیا اللہ اس کا ہو گیا۔ اور سب سے بڑھکر یہ کہ اس ذکر خداوندی کا صلہ اور ثواب اللہ کے ہاں بہت بڑا ہے۔ وہ گناہوں سے بریت درجات کی بلندی اور فلاح اخروی کا مستحق ہوتا ہے۔

باب (۷)

صبر

مطلب :- اس کے لغوی معنی برداشت اور استقلال کے ہیں۔ یعنی مصیبت کے وقت گلہ شکوہ نہ کیا جائے اور ایسا کوئی لفظ مُنہ سے نہ نکالا جائے جس سے تکلیف پر شکایت یا بے چینی کا اظہار ہو، اپنے آپ میں ضبط و سکون پیدا کرنا اور نہایت بہادری سے مصائب کو برداشت کرنا ہے۔

ظاہر ہے یہ صفت کوئی معمولی نہیں اور اس صفت سے متصف انسان نہایت عمٰی اور بلند کردار کا مالک ہوگا۔

امام غزالیؒ اس کا مفہوم اس طرح بیان کرتے ہیں کہ نیکی کی سپاہ کو برائی کی سپاہ کے مقابلے میں ڈٹ جانا اور ثابت قدم رہنا صبر ہے۔ اور یہ صفت صرف انسان کے ساتھ خاص ہے فرشتے یا حیوان اس سے عاری ہیں۔ کیونکہ فرشتے خیر کی طرف ہی رجوع کرنے والے ہیں وہ اللہ تعالےٰ کی تسبیح میں اور حمد و ثنا میں ہی ہمہ وقت مصروف ہیں اُن میں شر کی قوت کا وجود ہی نہیں جس سے خیر کا تصادم ہو اور حیوانات میں صرف شہوت یا نفسانی خواہش کا حصول ہی مقصود ہوتا ہے اِس صفت کے علاوہ کوئی دوسری متبادل صفت اِن میں موجود ہی نہیں کہ اس کا زور توڑ سکے اس لئے صبر صرف انسان ہی کا خاصہ ہے۔ بچپن میں انسان میں بھی حیوانیت کی خواہشات کی فراوانی ہوتی ہے اور ان خواہشات کی تکمیل نہ ہونے کی صورت میں اس میں صبر کی طاقت کم ہوتی ہے حتّٰی کہ وہ بالغ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالےٰ دو فرشتے مقرر کر دیتے ہیں ایک فرشتہ ہدایت جو انسان کو فطرت سلیم کے مطابق سیدھی راہ دکھاتا ہے اور دوسرا فرشتہ قوت کا مظہر ہے جو سیدھی راہ پر چلانے میں مختلف

ملکہ رکاوٹوں کو دور کرتا ہے اس کے ساتھ کافی لاؤ لشکر بھی ہوتا ہے۔ اس فوج کی برائی کی فوج سے اکثر لڑائی ٹھنی رہتی ہے اس مقام پر اس کی ثابت قدمی صبر کہلاتی ہے۔

حضرت سہیل فرماتے ہیں صبر کا مفہوم ہے شدید تنگی کا انتظار کرنا اور یہ سب سے افضل اور اعلیٰ خدمت ہے۔

فضیلت و اہمیت :-

قرآن پاک میں ستر سے زیادہ مرتبہ صبر کا ذکر آیا ہے اور اکثر مراتب کو صبر ہی کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

ارشاد ہے۔

وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِينَ صَبَرُوا أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ

اور ہم ضرور صبر کرنے والوں کو ان کے اعمال کا بہت اچھا اجر عطا کریں گے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہے۔

إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ - صبر کرنے والوں کو ان کے صبر کا بدلہ بغیر حساب کے پورا پورا دیا جائے گا۔

اور فرمایا۔ وَاصْبِرُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ

ملائکہ کی امداد

بَلَىٰ إِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُم مِّن فَوْرِهِمْ هَٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُم بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ ۔ یقیناً اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو اور دشمن تم پر دھاوا بول دیں تو تمہارا خدا پانچ ہزار نشان زدہ فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔

صبر کرنے والوں کے لئے خداوند کریم نے اس قدر انعام اکٹھے کر دیئے ہیں جو کسی دوسرے عمل کے لئے نہیں۔

ارشاد ہوتا ہے۔

أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ

المهتدون ۰

یہ وہی لوگ ہیں جن پر اللہ کے خاص احسانات در رحمتیں ہیں اور انہیں کے لئے ہدایت مقرر ہے۔
یہ بڑی بڑی نعمتیں ہیں جو صابروں کے لئے مخصوص ہیں۔

احادیث نبوی میں بھی صبر کی فضیلت کا وسیع طور پر ذکر ہے۔ حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ سے پوچھا گیا ایمان کیا ہے آپؐ نے فرمایا صبر اور سخاوت اسی طرح آپ نے فرمایا صبر جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔ حدیث قدسی میں ذکر ہے کہ اللہ تعالےٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی کی تو میرے اخلاق اختیار کر اور میری صفت یہ ہے کہ میں صبور ہوں۔

حضورؐ نے ایک حدیث میں فرمایا کہ تم لوگ اپنی پسندیدہ چیزیں صرف اس صورت میں حاصل کر سکتے ہو کہ اپنی ان اشیاء پر صبر کرو جو تمہیں پسند نہیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو خط میں لکھا کہ صبر کو لازم پکڑو اور خیال رکھو کہ صبر کی دو قسمیں ہیں (۱) مصیبتوں میں صبر، یہ بہت اچھی چیز ہے اور (۲) خدا کی حرام کردہ چیزوں سے صبر اور یہ دوسری قسم پہلی سے افضل ہے۔

امیر المومنین سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا صبر کا ایمان سے وہی رشتہ ہے جو سر کا انسانی جسم سے یعنی جس طرح جسم سر کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا اسی طرح ایمان صبر کے بغیر ممکن نہیں۔

یاد رہے کہ مریض کا مرض مضر اشیاء سے پرہیز کے بغیر بڑھتا جاتا ہے اور مضر اشیاء دو وجہ سے استعمال کی جاتی ہیں۔ ایک بوجہ غفلت کہ مریض کو ان اشیاء کے نقصان کا علم ہی نہیں ہوتا۔ اور دوسری ضد اور شدت خواہش کی وجہ سے کیونکہ ان اشیاء کو بوجہ کثرت استعمال کے چھوڑ نہیں سکتا روحانی امراض میں مرض کی طوالت کا اگر پہلا سبب ہے تو اس کا علاج تو بہ ہے۔ ارشاد ربانی ہے کہ اللہ تعالےٰ صرف ان لوگوں کی توبہ قبول فرماتے ہیں جو بوجہ نادانی اور جہالت کے بُرے اعمال کرتے ہیں پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں تو ان لوگوں کی توبہ اللہ تعالےٰ قبول فرما لیتے ہیں۔

اگر دوسرا سبب یعنی شدتِ خواہش ہے تو اس کا علاج صبر ہے۔ اس لئے ارشاد ہے۔
اور یقیناً ہم تم کو خوف، فاقہ، مال میں کمی جانوروں اور پھلوں کے ضیاع سے آزمائیں گے
و اے نبیؐ آپ صبر کرنے والوں کو خوشخبری دیں۔
اِن آیات اور احادیث اور آثار کی روشنی میں صبر کی فضیلت اور اہمیت واضح ہوجاتی ہے۔

صبر کی اقسام۔

صبر کی تقسیم مختلف لحاظ سے کی جاتی ہے۔ جن میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں۔
۱۔ باطنی قویٰ کے لحاظ سے، اس لحاظ سے اس کی تین قسمیں ہیں۔
۱۔ موجب فلاح۔ ب۔ موجب ہلاکت۔ ج۔ صبر معلق
باطنی طور پر انسان کے اندر دو قسم کی طاقتیں کام کرتی ہیں ملکوتی اور حیوانی یا شہوانی۔
(جیسے ذکر ہوچکا ہے کہ حیوانی اور شہوانی طاقتیں ایک ہی ہیں)
جن میں ہر وقت مقابلہ ہوتا رہتا ہے۔ اگر باہم مقابلہ میں ملکوتی طاقت غالب آئے اور اس غلبہ میں صبر کی بدولت دوام اور استقلال حاصل ہو تو یہ صبر موجب فلاح ہے اور اگر شہوانی قوت کا غلبہ ہو اور آدمی مایوس ہو کر اس پر قانع ہوجائے تو ایسا صبر ہلاکت کا باعث ہے اور تیسری صورت یہ ہے کہ ان دونوں طاقتوں میں برابری ہو اور مقابلہ کی صورت میں میدان کبھی ایک کے ہاتھ اور کبھی دوسری طاقت کے ہاتھ رہے، تو اس حالت میں صبر۔ صبر معلق کہلاتا ہے۔ اس میں کامیابی کی امید ہوسکتی ہے بشرطیکہ خدا کی رحمت اور تائید ایزدی شامل حال ہوجائے۔

۲۔ آسانی اور تنگی کے لحاظ سے۔
اس کا مطلب یہ ہے کہ کبھی تو صبر کرتے وقت بہت زیادہ جدوجہد کرنی پڑتی ہے اور کبھی تھوڑی سی کوشش سے یہ کام ہوجاتا ہے۔ پہلی قسم کو تصبر اور دوسری کو صبر کہتے ہیں

۳۔ حکم شرعی کے لحاظ سے۔ اس لحاظ سے اس کی چار قسمیں ہیں۔
فرض۔ نفل۔ مکروہ۔ حرام۔
۱۔ محرماتِ شرعیہ یعنی شرعاً حرام اشیاء سے بچنے کے لئے صبر فرض ہے۔

ب۔ تکلیفوں اور مصائب پر صبر نفل ہے۔
ج۔ اور ایسی تکالیف جو شرعاً مکروہ ہوں ان پر صبر مکروہ ہے۔
د۔ اور ایسی تکالیف پر جو شرعاً حرام ہوں صبر ناجائز اور حرام ہے۔

مقاماتِ صبر

زندگی میں انسان کو ہر طرح کے حالات سے سابقہ پڑتا ہے اور صبر پوری حیات انسانی سے متعلق ہے۔ جن حالات سے بھی انسان کو گذرنا پڑے صبر کا عمل دخل ہر حالت میں انسان کے ساتھ ساتھ رہتا ہے اور اکثر حالات میں مفید نتائج نکلتے ہیں یہی حالات و واقعات مقامات صبر ہیں۔ مثلاً

اس دُنیا میں انسان کو جن حالات سے سابقہ پڑتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ وہ امور جو اس کی خواہش اور طبیعت کے مطابق ہوتے ہیں، جیسے صحت سلامتی مال و دولت و مرتبت ذرائع آمدنی کی وسعت خدام احباب، رُفقاء اور دیگر دنیوی نعمتیں۔ ان حالات میں صبر کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے کیونکہ اگر اس مرفہ الحالی میں صبر اور انضباط سے کام نہ لیا جائے تو انسان سرکشی پر اُتر آتا ہے اور اِترا تا ہے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔

إِنَّ الْإِنسَانَ لَيَطْغَىٰ أَن رَّآهُ اسْتَغْنَىٰ - بیشک انسان جب اپنے آپ کو مستغنی اور دولت مند دیکھتا ہے تو سرکشی کرنے لگتا ہے۔

تکبر اور سرکشی مومن کا شیوہ نہیں بلکہ فرعونیت اور قارونیت کی علامت ہے اور یہ یقیناً موجب ہلاکت ہے۔ بعض مشائخ فرماتے ہیں کہ مصیبت میں تو ہر مومن صبر کرتا ہے لیکن آرام و آسائش کا سامان میسر آنے پر صرف صدیق ہی صبر کر سکتے ہیں۔

بادہ خوردن و بیہوش بودن سہل است ؎ گر بدولت برسی مست نگردی مردی

یعنی شراب کے جام پر جام لنڈھا جانا اور بیہوش نہ ہونا آسان ہے لیکن اگر تو دولت میں کھیلنے لگے اور پھر مدہوش نہ ہو تو واقعی مردی اسی چیز کا نام ہے۔

۲۔ وہ امور جو اس کی مرضی اور خواہش کے مطابق نہیں ہوتے، ان کی تین صورتیں ہیں۔

(ا) وہ امور جن کا تعلق انسانی اختیار سے ہوتا ہے۔ مثلاً اطاعت۔ اس میں صبر بڑا سخت ہوتا ہے۔ کیونکہ عبادت اور اطاعت میں صبر کا مطلب اپنی ذلت ہے جسے کوئی انسان طبعاً پسند نہیں کرتا۔ لیکن اس کے بغیر چارہ بھی نہیں اور اس پر صبر بہت ضروری ہے۔ یا نافرمانی اور معصیت۔ اس میں صبر کا مطلب یہ ہے کہ اس سے بچنے میں استقلال اور مداومت ہو یہ بھی بہت ضروری ہے۔

(ب) وہ امور جو انسانی اختیار میں نہیں ہوتے مثلاً کسی عزیز کی موت یا اچانک حادثہ میں شروع سے ہی صبر ضروری ہے پہلے جزع و فزع اور بے صبری کرنا کچھ فائدہ نہیں رکھتا۔ بلکہ اللہ تعالےٰ اسے ناپسند کرتے ہیں۔ اسی کے متعلق حضورؐ فرماتے ہیں کہ جب کوئی مومن کسی مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے پس وہ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کہتا ہے اور دعا مانگتا ہے کہ اے اللہ مجھے اس مصیبت سے نجات دے اور اس کا انجام اچھا فرما۔ تو اللہ تعالےٰ اس کی دعا قبول فرماتے ہیں۔

(ج) ایسے امور جن کا دافع ہونا تو انسان کے اختیار میں نہیں ہوتا البتہ وہ ان کے ازالے یا انتقام پر قادر ہوتا ہے۔ ایسے مقامات میں صبر کبھی ضروری ہوتا ہے اور کبھی افضل اسی بارے میں اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (اور تم ضرور ان لوگوں سے جن کو تم سے پہلے کتابیں دی گئیں اور مشرکوں سے بہت ہی زیادہ تکلیف دہ باتیں سنو گے اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ بات پختہ ارادے کے کاموں میں سے ہے۔

نتائج۔ صبر کا ذائقہ ضرور تلخ ہے لیکن اس کا پھل میٹھا ہے ایک دوا کا نام صبر ہے وہ بہت کڑوی ہوتی ہے لیکن اس کے استعمال سے نتائج نہایت شیریں اور صحت افزا پیدا ہوتے ہیں۔ صبر کا مادہ بھی صبر ہی ہے۔ صبر خدا کے انعامات میں سے ہے جس کا دل اللہ تعالےٰ نے صبر اور قناعت سے بھر دیا ہے۔ وہ بہت خوش نصیب انسان ہے اور پھر اللہ تعالےٰ کے ہاں اس عادت صالحہ کا بہت بڑا درجہ ہے۔ عربی میں صبر کے معنوں میں مداومت اور استقلال کا مفہوم پنہاں

ہے۔ قرآن پاک میں ایک جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا۔ یعنی اے بندۂ مومن تجھے چاہیئے کہ اپنے عیال و اطفال کو نماز پڑھنے کی تاکید کرے اور اس پر ثابت قدمی سے قائم رہے۔ یعنی کسی مخالفت یا نافرمانی کی پروا نہ کرتے ہوئے متواتر اور مستقل مزاجی سے اپنے بچوں کو نماز کا حکم دیتا رہے۔ صبر سے کام لینے والا شخص عموماً کامیاب ہوتا ہے اسے دنیا بھی با وصول اور کامیاب سمجھ کر عزت کی نگاہ سے دیکھے گی اور خداوند تعالیٰ کے ہاں بھی اس کا بہت عظیم اجر ہوگا۔

علاوہ ازیں اس کے نتائج کا بہت سا ذکر اس کی فضیلت کے عنوان کے ماتحت آچکا ہے۔

باب (۸)

شکر

مطلب :- کسی محسن کا احسان ماننا اور اس کی نعمت کی قدر کرنا شکر کہلاتا ہے اور
حتی الامکان اس نعمت کا صلہ دینے کی کوشش کرنا شکر کا بلند مقام ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے
جو نعمتیں عنایت فرمائی ہیں ان کا بدلہ اور صلہ انسان کی طاقت سے باہر ہے اس لئے خدا کا
شکر ادا کرنے کا یہ مطلب ہے کہ اس کی نعمتوں کا اعتراف اور اقرار کیا جائے شکر مقاماتِ دین میں
سے ایک مقام ہے اور اس کے تین مدارج ہیں۔

۱۔ علم یا معرفت :- یعنی یہ پہچاننا کہ یہ نعمت کس کی طرف سے ہے۔

۲۔ حال :- نعمت حاصل ہونے سے جو خوشی اور مسرت دل میں پیدا ہوتی ہے اسے حال
کہتے ہیں۔

۳۔ عمل :- انعام دینے والا جس غرض کے لئے وہ نعمت دیتا ہے اس نعمت کو حاصل کرکے
اس مقصد خاص کے مطابق اسے استعمال کرنا عمل کہلاتا ہے۔

شکر اِن تینوں کے مجموعے کا نام ہے۔ اور یہ ہمیشہ نعمت کے مقابلے میں ہوتا ہے اِس
کا تعلق انسان کے تمام اعضاء دل دماغ زبان وغیرہ سے ہے۔

یہاں اس سے مراد خدائے تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا ہے لیکن خدائے تعالیٰ کی
نعمتیں تو شمار میں نہیں آسکتیں، جیساکہ قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا۔ اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو

گنے لگو تو ان کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

پھر اگر شکر ادا کیا جائے تو وہ دل کے ساتھ یا زبان کے ساتھ اور دیگر اعضاء کے ساتھ کیا جائے گا۔ اور یہ چیزیں بجائے خود نعمتیں ہیں جن پر شکر واجب ہے تو پھر شکر

کس طرح ہو۔ اور پھر یہ بات بھی ہے کہ خدا کی نعمتیں کسی صلہ یا بدلہ کے لئے نہیں ہیں اور دوسرے انسانوں کی طرح اسے ہمارے بدلے یا صلے کی ضرورت بھی نہیں وہ ان باتوں سے بے نیاز ہے۔ نہ اسے ہماری خدمت درکار ہے۔

یہی سوال حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت موسیٰ کے دلوں میں بھی پیدا ہوا تھا انہوں نے عرض کیا کہ اے پروردگار ہم تیرا شکر کس طرح کریں کہ ایک نعمت کا شکر دوسری نعمت کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے۔ اور شکر بھی تیری نعمت ہے جس کے لئے شکر لازم ہے۔ تو خداوند کریم نے اس کی طرف وحی بھیجی اور فرمایا کہ اس حقیقت کی پہچان ہی تمہارا شکر بجالانا ہے۔ اور دین فطرت یعنی اسلام کی تعلیم بھی یہی ہے کہ اللہ کی نعمتیں اتنی زیادہ ہیں کہ انسان ان کا شکر بجالانے سے قاصر ہے اس لئے حتی الامکان تواتر کے ساتھ اور مستقل مزاجی سے اس کا شکر بجالانا چاہئے۔

اہمیت اور مقام شکر :- اللہ تعالےٰ اپنی پاک کتاب قرآن مجید میں ذکر کی عبادت کے ساتھ شکر کی عبادت کا بھی ذکر فرماتے ہیں۔ اس آیت پر غور فرمائیں۔ فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ۔ یعنی تم میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر کروں گا اور تم میرا شکر ادا کرو اور کفران یعنی ناشکری نہ کرو' کفر کفران اور ناشکری ہم معنی لفظ ہیں یعنی ناشکری اگر حد سے بڑھ جائے تو کفر بن جاتی ہے۔ ایسے آدمی کا دل ایمان سے خالی ہو جاتا ہے اور دنیا اور آخرت میں اس کا انجام عبرتناک ہوتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ اگر کوئی شخص شروع سے ہی کافر ہے اس میں اور اس شخص میں بہت فرق ہے جو اسلام قبول کرنے کے بعد کافر ہو گیا ایسے آدمی کے لئے ابدی جہنم ہے اور اگر کسی اسلامی حکومت میں کوئی ایسا شخص موجود ہے تو اس کی سزا مرتد کی سزا کی طرح ہے۔ جو قتل ہے۔

۲۔ شکر کا مقام اس قدر بلند ہے کہ عذاب الہٰی اسے چھو بھی نہیں سکتا یعنی وہ ہر حال میں عذاب

الہٰی سے محفوظ ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ

(اے مومنو! خدا تمہیں عذاب الہٰی سے محفوظ رکھنگا بشرطیکہ تم شکر بجا لاتے رہو اور ایمان مضبوط رکھو۔

۳۔ شکر گزاری اور ایمان کی حیثیت کافی حد تک ایک سی ہے۔ ابلیس نے خدا تعالےٰ کے سامنے دعویٰ کیا تھا۔

وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ۔ اور تو اکثر لوگوں کو شکر کرنے والے نہیں پائیگا۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح باقی خوبیوں سے محروم کر کے وہ انسان کو خدا سے دور کرنے کا چیلنج کر رہا ہے اسی طرح شکر کی صفت سے مومن کو محروم کر کے نجات سے محروم کرنے اور خدا سے دور لے جانے کا دعویٰ بھی کر رہا ہے۔

۴۔ نعمت خداوندی کی فراوانی کا بھی شکر کی صفت سے گہرا تعلق ہے فرمایا۔

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ۔

(اگر تم شکر کرو گے تو میں اور بھی زیادہ نعمتیں دوں گا اور اگر تم کفر کرو گے یعنی ناشکری اختیار کرو گے تو یاد رکھو میرا عذاب بہت سخت ہے۔

۵۔ حضورؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ تم اللہ کے اخلاق کو اپنے اندر پیدا کرو شکر بھی اللہ کی صفت ہے۔ یعنی اس کا نام شکور بھی ہے جس کے معنی قدر دان کے ہیں اس لئے خدا کے اوصاف سے متصف ہونے کے لئے شکر کی صفت پیدا کرنا بڑا وصف ہے۔

مندرجہ بالا آیات قرآنیہ کے علاوہ بہت سی احادیث میں حضورؐ نے شکر کی بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے۔

آپؐ عام طور پر دن کو روزہ سے ہوتے تھے اور رات کو عبادت کے لئے شب زندہ داری کرتے تھے حالانکہ آپ اللہ کے محبوب اور مغفور اور مبشر بالجنت تھے جب آپ کے صحابہ کرام میں سے چوٹی کے سرکردہ دس صحابہ کو دنیا ہی میں جنت کی بشارت مل چکی تھی تو آپؐ تو ان کے نبیؐ اور رسولؐ تھے۔ ایک دفعہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے آپ سے

پوچھا کہ یا رسول اللہؐ آپ رات کو قیام کرتے ہیں اور اتنا روتے ہیں کہ سینۂ مبارک تر ہو جاتا ہے حالانکہ آپ یقینی طور پر مغفرت یافتہ ہیں۔ آپؐ نے جواب میں فرمایا اے عائشہؓ کیا میں خدا کا شکر گذار بندہ نہ بنوں۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن بلند آواز سے پکارا جائے گا۔ کہ حمادون اٹھ کھڑے ہوں" ایک گروہ کھڑا ہو جائے گا پھر ان کے لئے جھنڈا گاڑ دیا جائے گا اس کے پیچھے پیچھے وہ تمام لوگ جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ پوچھا گیا' یا رسول اللہ حمادون کون لوگ ہوں گے آپؐ نے فرمایا جو ہر حالت میں شکر الٰہی بجا لاتے ہیں۔

مشائخ کا قول ہے کہ ایمان کے دو حصے ہیں آدھا صبر اور آدھا شکر اور حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

شکر کی اقسام۔

ا ۔ شکر قلبی۔ یعنی دل سے شکر کرنا مطلب یہ کہ انسان دل سے اس بات کا اعتراف کرے کہ دنیا کی تمام نعمتیں خدا کی عطا کردہ ہیں اور یہ احساس بندے کی عبودیت اور خدا کی الوہیت کے عقیدے کو پختہ کر دے پھر وہ تمام بنی نوع انسان کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک کا ارادہ اپنے دل میں رکھے کسی سے بُرائی کا شائبہ تک بھی اس کے دل میں نہ گذرے

(ب)، شکر لسانی ۔ یا شکر قولی یعنی زبان سے شکر ادا کرنا۔ منعم حقیقی کے انعامات کا احساس رکھتے ہوئے اس کی برتری کے عقیدہ کا زبانی اظہار اور قولی طور پر اپنے شکر کے اعلان کو شکر لسانی یا شکر قولی کہا جاتا ہے۔ شرع میں ان الفاظ کے ادا کرنے کے لئے خاص کلمات ہیں مثلاً الحمد للہ اور شکر للہ لیکن عموماً پہلے ہی فقرے میں دوسرے فقرے کا مفہوم آجاتا ہے جب کوئی مسلمان کسی مسلمان سے اس کا حال دریافت کرے تو دوسرے مسلمان کو الحمد للہ کہنا چاہیئے۔

(ج) ۔ شکر الجوارح ۔ یعنی مختلف اعضاء کی حرکات و سکنات اظہار شکر۔ مثلاً آنکھوں کا شکر یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان کا عیب دیکھو تو چشم پوشی کرو' کانوں کا شکر یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان کی بُرائی سنو تو اس کی تشہیر سے بچو۔ یہی حال باقی اعضاء کا ہے

کہ انھیں خدا کی عبادت میں مصروف رکھا جائے اس طرح حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پوری طرح ادا کیا جائے۔

نتائج:۔ شکر کا اجر خدائے تعالےٰ کی نعمتوں کا زیادہ سے زیادہ حصول ہے اس طرح اس کی رضا اور انعام دونوں ملتے ہیں۔ اس کے فقدان سے عذاب اور شدائد اور خسران ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ انسانیت کا جوہر ہے اور گویا یہ خدا کا حق ہے جو ایک مومن بندہ کے ذمہ ہے۔

باب (۹)

عفو

مطلب :- عفو کے معنی معاف کر دینا، درگزر کرنا اور انتقام نہ لینا ہے۔ شرعی اصطلاح میں اس سے مراد ہے کہ ایک آدمی پر اگر زیادتی کی جائے اور وہ انتقام کی قدرت رکھنے کے باوجود اس سے درگزر کرے تو یہ عفو ہوگا امام غزالیؒ فرماتے ہیں۔

اگر کسی پر تاوان یا قصاص کا حق ثابت ہوتا ہو تو اسے چھوڑ دینا اور بریت کا اعلان کرنا عفو ہے بدلہ لے لینا تو ہر طاقتور کا کام ہے لیکن معاف کر دینا بڑی ہی بہادری کا کارنامہ ہے۔

فضیلت و اہمیت :- ارشاد باری تعالےٰ ہے۔

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ۔

عفو اختیار کرو نیکی کا حکم دو اور بے وقوفوں سے دامن بچاتے رہو۔

(۲) اگر اللہ تعالےٰ لوگوں کی بداعمالی پر گرفت کرنا شروع کر دے تو اس کے عذاب سے کسی کو مفر نہ ملے اور دنیا میں کوئی پناہ گاہ نہ مل سکے ہر شخص اپنی کرتوتوں کے عوض مبتلائے عذاب نظر آئے لیکن اللہ کی یہ عادت نہیں، اللہ کی اس صفت کا نام عفو ہے حضورؐ کو بھی خدائے تعالےٰ کی طرف سے حکم ہے کہ آپ لوگوں کو معاف اور درگزر کیا کریں

۳۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری زندگی رحم عفو اور درگزر کا بہترین مرقع تھی۔ سینکڑوں مثالیں آپ کی حیات طیبہ میں ہیں کہ آپ اپنے خون کے پیاسوں پر قابو پانے کے بعد انہیں معاف کر دیا کرتے تھے اور اشاعت اسلام میں آپ کی اس خصلت مبارکہ

کا بہت بڑا حصہ سے آپ کی بلند کرداری کی بہترین مثالیں زیادہ تر عفو اور درگزر پر مشتمل ہیں۔
حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ حضورؐ نے کبھی کسی سے انتقام لیا ہو جبتک کوئی حرام چیزوں میں دخل اندازی نہ کرتا اور اس سلسلہ میں آپ کا غصہ بہت سخت ہوجاتا تھا کیونکہ یہ جرم اجتماعی نوعیت کا ہے۔ کفارِ مکہ نے آپ کو کیا کیا تکلیفیں نہیں دیں۔ آپ کے راستہ میں کانٹے بچھائے گئے آپ کو پتھروں سے لہولہان کیا گیا۔ آپ پر گندگی ڈالی گئی۔ آپ پر بحالت نماز اونٹ کی اوجھ لادی گئی۔ تین سال تک متواتر آپ کو اور آپ کے خاندان کو شعب ابی طالب میں محصور کیا گیا۔ آپ کو نہ صرف جھٹلایا گیا بلکہ کاہن مجنون اور ساحر کے القاب دئے گئے۔ لیکن انہی قریش مکہ سے آپ نے فتح مکہ کے روز کیسا فیاضانہ برتاؤ کیا اور کس قسم کے عفو اور درگزر کا ثبوت دیا کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ کفارِ مکہ کو بھی یقیناً آپ سے عفو و درگزر ہی کی توقع تھی لیکن آپؐ نے ان کی توقع سے بھی بڑھ کر حسن سلوک روا رکھا۔ اور تو اور اپنے حقیقی چچا امیر حمزہؓ کے قاتلوں کو معاف کردیا اور جگرخوار عم رسولؐ ہندہ کو بھی معافی دے دی۔

(۴)۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک عزیز مسطح کی مالی امداد اس لئے بند کردی تھی کہ اس نے واقعہ افک کی تشہیر میں حصہ لیا تھا، جب جناب عائشہ صدیقہ کی بریت کی آیات نازل ہوئیں تو ساتھ ہی ارشاد ہوا کہ تم میں مالدار آدمی کسی محتاج کی اعانت سے اس لئے ہاتھ نہ کھینچیں کہ انہوں نے ان کے خلاف کوئی اقدام کیا ہے بلکہ انہیں چاہیے کہ اعانت کا سلسلہ جاری رکھیں کیا وہ نہیں چاہتے کہ اللہ انہیں بخش دے اس پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فوراً دوبارہ امداد جاری کردی اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ اللہ مجھے بخش دے۔

۵۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ۔

برائی کا بدلہ تو اسی کی مانند برائی ہے۔ لیکن جو آدمی معاف کردے اور حالات کو درست

کرے تو اس کا اجر اسے اللہ کے ہاں ملے گا۔

عفو کی حدود:۔ اس میں شبہ نہیں کہ معاف کر دینا بڑی اعلیٰ صفت ہے لیکن اگر یہ صفت حد سے بڑھ جائے۔ تو اس کے نتائج بجائے مفید کے لئے مضر صورت میں نکلتے ہیں۔ غصہ انسان کی کمزوریوں میں سے ایک کمزوری ہے۔
لیکن یہ ایک جبلی چیز ہے جو انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اگر اسے روکا نہ جائے اور ہر جا و بیجا موقعہ پر اسے قابو میں نہ لایا جائے تو اس سے بڑے ہولناک نتائج بھی نکل سکتے ہیں اس کے علاوہ جلدبازی سے اگر غصے کی حالت میں کوئی ایسا قدم اٹھالیا جائے جو غلط ہو تو بعد میں انسان پچھتاتا ہے لیکن وقت نکل جانے کے بعد پچھتانا بے سود ہوتا ہے۔ حضورؐ کی حدیث ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ بہادری یہ نہیں کہ کوئی آدمی کسی دوسرے کو گرا دے اور غالب آجائے بلکہ بہادری یہ ہے کہ غصے کے وقت اپنے جذبات کو اپنے قابو میں رکھے۔ متقدمین اور متاخرین سے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے کئی طریقے منقول ہیں ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ٹھنڈا پانی پی لیا جائے اس طرح غصہ اعتدال پر آجاتا ہے لیکن یہ ساری کی ساری تدبیریں غصے کو اعتدال پر لانے کی ہیں بالکل ختم کرنے کی نہیں۔ کیونکہ جہاں اس فطری جذبے کے نقصان ہیں وہاں اس کو اعتدال پر رکھ کر اس سے کئی مفید کام بھی لئے جا سکتے ہیں۔
حکماء کا قول ہے کہ غصہ کی جبلت بالکل ختم کرنے سے انسان کی زندگی غیر معتدل ہو جاتی ہے اور انسان میں بزدلی پیدا ہو جاتی ہے اور غیرت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور شجاعت اور بہادری کے اوصاف بالکل زائل ہو جاتے ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے۔
وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ اور وہ جو غصے کو پی جاتے ہیں۔ یعنی غصے کو حد اعتدال پر لے آتے ہیں۔ یہی اعتدال عفو میں بدل جاتا ہے، اس کے بعد فرمایا۔
وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ اور وہ جو لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں۔
لیکن بعض لوگوں کی فطرت میں نقص ہوتا ہے اور ان کو یہ صفت راس نہیں آتی وہ درگزر اور عفو کو کمزوری اور بیچارگی پر محمول کر کے اپنے جرائم میں اور زیادہ دلیری اختیار کر لیتے ہیں، ایسے لوگوں سے درگزر کرنا نیک لوگوں پر زیادتی کے مترادف ہے۔ جو

کسی طرح جائز نہیں۔
شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں۔

نکوئی با بداں کردن چنانست
کہ بد کردن بجائے نیک مرداں

بُرے آدمیوں سے نیکی کرکے انہیں جُرم پر اور دلیر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ نیک اور شریف لوگوں پر ظلم ہو۔ ایسے مقامات اور مواقع پر عفو کی بجائے انتقام اور سختی اچھی رہتی ہے۔ قرآن پاک میں خدائے تعالےٰ کا ارشاد ہے۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ۔ یعنی اے عقل والو تمہارے لئے بدلہ اور انتقام ہی قومی زندگی کی بقا کا سبب ہے۔

شرعی تعزیریں :- بالکل فطرت انسانی کے مطابق اور امن و امان کی ضامن ہیں اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔

وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ یعنی فتنہ اور بدامنی قتل سے زیادہ خراب ہیں۔ آج کل کے مادہ پرست اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والے طبقات جو قانون اور امن و امان کے مالہ و ما علیہ کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ قرآنی تعزیروں کو وحشیانہ اور ظالمانہ تصور کرتے ہیں۔ حقیقت میں ان کی نگاہ یورپین ماحول اور پروپیگنڈا سے اس حد تک متاثر ہے کہ اس کے علاوہ کسی فطری ماحول یا جُدا گانہ نظریہ کی ان نگاہ میں کوئی حقیقت ہی نہیں ان کی نگاہ محدود اور نا ویہ نظر مسدود ہیں۔ لیکن میرا اور ہر ایک حقیقت شناس کا نظریہ یہ ہے کہ مجرم سے نرمی در جُرم سے چشم پوشی کی سزا پورے معاشرہ کو ملتی ہے اور اس طرح جرائم کی سزا میں مداہنت اور چشم پوشی، درق نون کے وہ ایچ پیچ جن کی بنا پر مجرم اور ملزم کی بریت کے کئی ڈھنگ ہیں پوری قوم کے لئے دبال جان بن جاتی ہیں۔ امن و امان مفقود اور جُرم کھلے بندوں ہوتا ہے یاد رہے کہ اسلامی تعزیریں مین فطرت انسانی کے مطابق ہیں۔ مجرم سے نرمی یا عدم التفات ایک بین الاقوامی جرم ہے۔ جو ناقابل معافی ہے۔

اور حدود شرعیہ کے اجراء میں یہ شرط ہے کہ مجرم کو علی الاعلان اور علی رؤس الاشہاد سزا ملنی چاہیئے اس طرح جرم کی حوصلہ شکنی اور عوام کی عبرت مقصود ہے۔ اس کے علاوہ مجرم کو سزا میں جتنی دیر ہوگی اور مجرم کو جتنی ڈھیل ملے گی معاشرہ کے لئے اتنی ہی تکلیف اور تذبذب کی حالت اور بحرانی کیفیت پیدا ہوگی۔ اس لئے معاشرہ کی اصلاح اور قوم میں امن وامان کی توسیع کے لئے دو چیزیں بہت ضروری ہیں اور جرم کی بیخ کنی میں مددگار ہیں۔ ایک تو سزا عبرتناک ہو جیسا کہ شرعی تعزیروں کا مقصد ہے دوسرے سزا میں دیر نہ کی جائے اور انصاف سہل الحصول ہو۔

نتائج :- مندرجہ بالا بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ عفو ایک روحانی صفت ہے اور بندوں کے لئے اس پر عمل کرنا ان کے اپنے درجات کی بلندی اور اخلاق عالیہ کی بلندی کی دلیل ہے۔ عفو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا محبوب عمل تھا صحابہ کرام تابعین اور تبع تابعین میں یہ صفت نمایاں تھی ساتھ ہی اس صفت کے کچھ حدود بھی ہیں اگر پیرکہ دمر اور بُرے بھلے پر اس صفت کا استعمال غیر محدود طور پر کیا جائے تو اس سے مجرم کو دلیری اور امن وامان میں خلل پڑنے کا احتمال بھی ہے۔ اس لئے خراب شدہ معاشرہ میں اس صفت عفو کو حدود شرعیہ کے اندر رہ کر ہی جاری ہونا ضروری ہے اگر حدود شرعیہ کے پامال ہونے کا احتمال ہو اور عفو کی صفت کے ناجائز اور بلامحل وموقع استعمال کی عام عادت پڑ جائے تو قوم اور معاشرہ کے لئے وبال بن جاتی ہے۔ اور بجائے مفید ہونے کے الٹی نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔

باب (۱۰)

عدل

مطلب :- سیدھا کرنا، برابر تقسیم کرنا۔ متوازن اور متناسب بنانا۔ دنیا میں ہر چیز اور کام میں تین مدارج ہوتے ہیں۔ ادنیٰ۔ اوسط اور اعلیٰ۔ اوسط یا درمیانہ درجہ عدل کہلاتا ہے اسی لفظ سے اعتدال نکلتا ہے جس کا مطلب درمیانہ درجہ اختیار کرنا یا میانہ روی ہے۔

حدیث میں ہے خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُھَا - یعنی بہترین امور وہ ہیں جن میں میانہ روی ہو۔ اور جو افراط اور تفریط سے دُور ہوں اور ہر بات بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے کہ ہر چیز کو اس کے اصل مقام پر رکھا جائے۔ اِس سے تجاوز کا نام ظلم ہو گا جو عدل کی ضد ہے۔ عدل کے لئے انصاف کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے جس کا مطلب برابر برابر تقسیم ہے۔ لیکن عدل کا مطلب یہ نہیں کہ برابر برابر ہی تقسیم کیا جائے۔ بلکہ تقسیم میں توازن اور تناسب ضروری ہے۔

اہمیت اور فضیلت :-

(۱)۔ عدل کے بارے میں قرآن پاک میں خدائے تعالےٰ کا ارشاد ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ - یقیناً اللہ تعالےٰ عدل اور احسان کا حُکم دیتا ہے۔

۲ - اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو بھی عدل اور انصاف کا خصوصی حُکم دیا ہے۔

۳۔ سارے کا سارا نظام کائنات عدل ہی کے بل پر قائم ہے اگر نظام شمسی اور اجرام فلکی میں عدل یا پابندیٔ وقت نہ رہے تو کائنات کا نظام درہم برہم ہو جائے اور حیات انسانی ختم ہو جائے اسی طرح جسم حیوانی اور جسم انسانی کے اعضا وجوارح بھی نظام عدل پر قائم ہیں۔ اخلاط میں عدل اور توازن شرط ہے، ورنہ صحت خراب ہو جائے اور زندگی ختم ہو جائے ہر اعضاء کے اپنے اپنے دائرہ کار میں عدل اور توازن صحت کے لئے شرط اول ہے اس طرح زندگی کے ہر شعبہ میں عدل اور منظم طریق کار شرط ہے۔

۴۔ گھر کے معاملات میں زوجین پر بھی عدل و انصاف اور متوازن زندگی کے اصول پر عمل درآمد شرط ہے۔ اسلام نے ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کی شرائط میں سب سے مقدم شرط عدل رکھی ہے۔ اسی طرح لڑکوں اور لڑکیوں میں برابری اور عدم ترجیح کا اصول بھی کنبہ کے فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔ میراث میں حصہ رسدی جو شرع نے مقرر کئے ہیں وہ عدل پر ہی مبنی ہے۔

۵۔ لین دین اور معاملات میں اور ناپ تول میں عدل کو نہایت ہی اہمیت دی گئی ہے۔ ورنہ معاشرے میں خرابیاں اور فساد اور امن و امان مفقود ہو جاتا ہے۔ فرمایا وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ۔ ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا کرو۔ وَاَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ۔ وزن انصاف کے ساتھ قائم کرو اور تولنے میں کمی نہ کرو۔

معاشرے کے بعد ریاست اور حکومت کا دائرہ کار ہے۔ اس میں اجتماعی نظام کا قیام اور عدل میں بغیر کسی رو رعایت اور لحاظ کے سب کے لئے یکسانیت کا برتاؤ کیا جانا لازمی ہے۔ اگر کسی خاص طرف ناجائز جھکاؤ ہوگا تو اس سے انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوں گے اور یہ صورت حال بالآخر معاشرے اور حکومت کی تباہی اور بربادی پر منتج ہو سکتی ہے۔

کاتب اور عرضی نویس کے لئے جو حیثیت اختیار کر کے کافی موثر ثابت ہو سکتے ہیں ان کے لئے قرآن پاک میں احکام موجود ہیں حکم ہے۔ وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ

بِالْعَدْلِ اور تمہارے درمیان کاتب کو چاہئے کہ انصاف کے ساتھ تحریر کرے ۔ اگر مدعی یا مستغیث نابالغ یا فاتر العقل ہے اور مضمون مقدمہ خود نہیں لکھوا سکتا تو اس کا سرپرست لکھوائے لیکن عدل کے ساتھ اس کے بعد گواہوں کو حکم دیا گیا ہے کہ انصاف کے ساتھ گواہی دیں ۔ اگر کوئی فریق ناجائز ذرائع استعمال کر کے حاکم یا قاضی پر اثر ڈالے یا اُسے رشوت دے کر اپنے حق میں فیصلہ کرانے کی کوشش کرے تو اسے حکم ہے کہ ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر نہ کھاؤ اور آخر میں حاکموں یعنی مجالس اپیل کے عہدیداروں کو فیصلہ دینے کے سلسلے میں اس حکم الہٰی کا پابند بنایا جاتا ہے ۔

وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ ۔ جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل سے کرو ۔

حدیث میں ہے کہ اگر کوئی حاکم مر گیا اور مرنے سے پہلے اس نے لوگوں سے خیانت کی یعنی عدل نہ کیا تو اس پر جنت حرام ہے ۔

۲۔ حدیث میں ہے کہ حضورؐ کے زمانے میں قریش کی ایک عورت نے جس کا نام فاطمہ تھا چوری کی ۔ حضورؐ نے اس کا ہاتھ کاٹ دینے کا حکم دیا ۔ قریش کے کچھ سردار اس حکم کو ٹالنے کی کوشش کرنے لگے ۔ اور سفارش کرائی حضورؐ کا چہرۂ مبارک غصے سے سرخ ہو گیا ۔ آپ نے فرمایا کہ پہلی اُمتیں اس لئے تباہ ہوئیں کہ ان میں غریبوں اور امیروں میں سزا کے معاملے میں فرق کیا جاتا تھا ۔

خدا کی قسم اگر فاطمہؓ بنت محمدؐ بھی چوری کرتی تو اس کے بھی ہاتھ کاٹ دئے جاتے ۔

عدل و انصاف کے نفاذ کی اس سے بڑی اور بین مثال کیا ہو سکتی ہے ۔

عدل کے تقاضے !

۱۔ غیر مسلموں کے ساتھ انصاف :۔ مسلمانوں کا مسلمانوں کے ساتھ عدل و انصاف کا برتاؤ تو عام سی بات تھی لیکن یہ اسلام کا فیض تھا اور یہ مسلم اُمت کی شان خصوصی تھی کہ عدل اسلامیہ کا سایہ غیر مسلموں اور مسلمانوں پر یکساں پڑتا تھا ۔ کسی غیر مسلم سے اس لئے بے انصافی کا برتاؤ نہ کیا جاتا تھا کہ وہ غیر مسلم ہے تاریخ ان واقعات سے بھری

: ن ہے کہ کس طرح ایک امیر مملکت بعض دفعہ ایک یہودی یا عیسائی غیر مسلم کے ساتھ کسی مقدمے میں ملوث ہوا اور اس امیر سے کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا گیا۔ اور ایک عام مسلمان کے ساتھ غیر مسلم کے مقابلے میں امتیازی سلوک کا تو سوال ہی نہ تھا۔

۲۔ رشتہ داری عدل کے لئے رکاوٹ نہ بنے :۔ قرابت داروں سے اس لئے امتیازی سلوک روا رکھنا کہ وہ ان کے عزیز ہیں یا رشتہ دار ہیں بھائی ہیں یا ماں باپ ہیں یا اُن کا خود اپنا معاملہ ہے بالکل ناجائز ہے اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى۔

اور جب تم بات کرو تو عدالت اور دیانت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو اگرچہ یہ بات تمہاری اقربار کے خلاف ہی جائے۔

دینِ فطرت کی سچائی کا اس سے زیادہ ثبوت اور کیا ہوگا اور خدارا غیر مسلم معترضین اسلام بتائیں کہ دین فطرت پر آپ کے اعتراضات میں کچھ بھی وزن ہے یا ہٹ دھرمی اور تعصب ہی آپ کو اکسا رہا ہے۔ کہ آپ آئے دن حضورؐ کی ذات بابرکات پر سب وشتم اور طرح طرح کے لچر قسم کے اعتراضات کی بوچھاڑ کرتے نہیں تھکتے۔ اور لطف یہ کہ ہماری حکومت ٹس سے مس نہیں ہوتی، بلکہ بعض "آزاد خیال یا مادر پدر آزاد جس کا ترجمہ بے اصول اور بے دین اور مادہ پرست ہونا چاہیئے خود نام نہاد مسلمانوں میں اس مملکت اسلامیہ میں ہی پیدا ہو گئے ہیں خصوصی طور پر احادیث نبیؐ کا انکار کرنے والے مغربی معترضین کے "لہ کار ہیں۔

۳۔ دشمنوں کے ساتھ انصاف ۔ اسلامی عدل کا دائرہ دشمنانِ اسلام تک بڑھ... ہی ہے۔ اگرچہ ان سے مسلمانوں کا کوئی معاہدہ بھی نہ ہو یعنی حربی کافروں کے ساتھ بھی اہلِ اسلام کو عدل و انصاف کرنے کا حکم ہے۔ اسلام کے علاوہ اور کسی مذہب میں اس قدر فراخ دلی اور وسعت قلبی موجود نہیں۔ عموماً ہر مذہب میں دشمنوں سے رواداری کا وجود تک نہیں ہے اُن سے ہر طرح کا دھوکا اور ان کے خلاف ہر طرح کے بین الاقوامی جرائم کو جائز قرار دیا جاتا ہے۔ امریکن جو اپنے آپ کو عیسائیت سے منسلک کرتے ہیں باقی ایسے

مالک سے کیا سلوک کر رہے ہیں جن کو وہ اپنا مخالف سمجھتے ہیں۔ ویت نام میں لڑائی کی بنیاد گذشتہ صدر امریکہ جانسن نے اپنے عہدہ سنبھالتے ہی شروع کر دی تھی اور اس طرح نفسانیت دشمنی اور بربریت کا ثبوت دیا تھا حالانکہ ویت نامیوں کو بھی اختیار ہونا چاہیئے کہ جس طرح چاہیں اپنی قسمت کا فیصلہ کریں۔ اور جو نسی حکومت چاہیں بنائیں ان معاملات میں امریکہ کی مداخلت کیا اس پسندی کا ثبوت ہے۔ اور پھر اہلِ اسلام کے دشمنوں اور عیسائیوں کے دشمنوں یعنی یہودیوں کے ساتھ امریکی حکومت انتہائی دوستی کی پینگیں بڑھاتی رہتی ہے انہیں اسلحہ جنگ اور طیارے اور جدید ترین سامانِ حرب سے لیس کر کے مسلمانوں کی دل آزاری اور قتل و غارت و بالا رگرم کر رہے ہیں۔ بھی امریکہ اور برطانیہ کا ہاتھ ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو اسرائیل کبھی کا نیست و نابود ہو چکا ہوتا۔

یہ مثالیں میں نے اس لئے دی ہیں کہ اسلام کی تعلیم جو انسان دوستی پر مشتمل ہے اس کا مقابلہ موجودہ مادہ پرست اور مفاد پرست دور سے کروں اور ثابت کروں کہ اسلام دشمنی میں ہر مذہب و ملت کے غیر مسلم ایک ہو کر اور متحد ہو کر صف آرا ہو جایا کرتے ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کو کبھی کسی نعرہ سے خواہ وہ سوشلزم کا ہو یا اور کسی ازم کا دھوکا نہیں کھانا چاہیئے۔ اور صرف اسلام ہی کے قانون نافذ کرنے میں اپنی مساعی کو بروئے کار لانا چاہیئے۔ کیونکہ دینِ فطرت ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا۔ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى۔ اور نہ مجرم بنائے تم کو دشمنی کسی قوم کی اس بات پر کہ تم عدل سے ہٹ جاؤ۔ عدل ہمیشہ اختیار کرو کہ تقویٰ اور پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم کسی قوم سے دشمنی رکھتے ہو تو اس دشمنی کی وجہ سے یہ جرم نہ کر بیٹھنا کہ ان سے بے انصافی کا برتاؤ کر دیا' بے انصافی کے برتاؤ میں کسی کی تائید کرو' تم عدل کو کسی قیمت پر بھی نہ چھوڑو کیونکہ عدل ہی پرہیزگاری اور تقویٰ کی علامت ہے۔

عدل کی یہاں تک اہمیت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

قیامت کے دن عرشِ اعلیٰ کے سایہ کے سوا اور کہیں سایہ نہ ہوگا۔ اس دن سات قسم کے گروہ ہوں گے جو اس عرشِ الٰہی کے سایہ میں ہونگے۔ ان میں ایک امام عادل بھی ہے یعنی عدل کرنے والا حاکم۔

باب (۱۱)

احسان

معانی :- احسان کا لفظ حُسْن یا حَسَن کے مادوں سے ماخوذ ہے لیکن قرآن پاک اور احادیث میں دوسرے مادے کو ترجیح ہے یعنی حَسَن جس کے معنی نیکی اور حُسْن سلوک کے ہیں اور حسن کے معنی خوبصورتی اور جمال کے ہیں۔ اگر اس مادہ سے احسان کو مشتق قرار دیا جائے تو کام اور عمل میں خوبصورتی اور زینت کی موجودگی لفظ احسان کا مفہوم ہوگا۔ بہرحال زیادہ تر مفسرین نے احسان کا مادہ حَسَن ہی لیا ہے۔ اور احسان کا مطلب یہ ہوگا کہ انصاف اور عدل کے تقاضوں سے بھی افضل تر عمل کا ثبوت دینا احسان کہلاتا ہے۔ قرآن کی آیت ذیل میں عدل کے ساتھ احسان کا لفظ بھی آیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ۔ اس سے مندرجہ بالا مطلب کا یہی اظہار ہوتا ہے۔

احسان کے معانی تفصیل سے سمجھنے کے لئے حضرت جبریل علیہ السلام والی مشہور حدیث پر غور کرنا چاہئے۔ سائل (جبریلؑ) نے حضورؐ سے پوچھا کہ احسان کیا ہے۔ حضورؐ نے احسان کو واضح کرتے ہوئے ایک مثال دی فرمایا

اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ

تو نماز اس طرح پڑھے گویا تو اسے یعنی خدا کو دیکھ رہا ہے۔ (یہ احسان کا اعلیٰ درجہ ہے) اور اگر یہ درجہ حاصل نہ ہو تو کم از کم نماز اس طرح ادا کرے کہ تو سمجھے کہ وہ تم کو

دیکھ رہا ہے۔
یہ نماز کو با حسن طریق یا احسان کے ساتھ ادا کرنے کا طریق ہے۔
عدل تو ہر حال میں واجب اور اس وجوب سے انحراف گناہ اور معصیت اور حقوق العباد کی عدم ادائیگی کا ثبوت ہے جس کے لئے خدا کے ہاں بڑی بھاری سزا ہے لیکن اسلام کے پیروکاروں کی زندگیوں میں عدل کی جگہ احسان کو داخل کرنے کا یہ مطلب ہے کہ یہ ایک مثالی اور بہترین اُمت کے افراد ہیں اور ان کا اخلاق بلند درجہ کا حامل ہے اور اس کی تعلیم میں ایثار واحسان اور خدمتِ خلق کے اسباق ہیں جو دُنیا میں کسی ملت یا مذہب یا دین کے ماننے والوں میں نہیں۔ اوپر عبادتِ الٰہی میں احسان کی مثال گذر چکی ہے یہ حقوق اللہ میں احسان کی مثال ہے۔ لیکن حقوق العباد میں بھی احسان کو ضروری اور شرفِ انسانیت کا ثبوت اور حسنِ عمل کا معیار قرار دیا گیا۔

اہمیت:

۱۔ قارون جو بنی اسرائیل کا دولت مند ترین انسان تھا اسے اس کی قوم کے صالح افراد نے کہا تھا بقول آیت ذیل۔
أَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ ۔ تو لوگوں پر اس طرح احسان کر جس طرح اللہ نے تجھ پر احسان کیا ہے۔ یعنی جو مال و دولت تجھے خدا نے دی ہے اس کو اللہ کے بندوں پر خرچ کر کے ان پر حسن سلوک کر

۲۔ اللہ کا محبوب وہ شخص ہے جو احسان اختیار کرتا ہے۔ فرمایا۔
وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۔ اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا اور محبت رکھتا ہے۔ یہ درجہ حاصل کر کے ایک انسان کتنی بڑی کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے۔

۳۔ حدیث نبوی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز حتیٰ کہ قربانی کے جانوروں پر احسان کرنا بھی ضروری قرار دیا ہے۔
قربانی اس طرح کرنی چاہیئے کہ چھری خوب تیز ہو تاکہ جانور کو زیادہ تکلیف

نہ ہو اور اگر کسی کو کسی جرم میں قتل کیا جائے تو اس طرح قتل کیا جائے کہ اُسے مضرت اور تکلیف کم سے کم ہو۔

مقاماتِ احسان۔

۱۔ خدا کے ساتھ احسان ۔ خدا کے انعامات اور احسانات تو اس قدر ہیں اور اتنی کثرت سے ہیں اور اس قدر متنوع ہیں کہ ان کے بدلے میں ایک انسان ایک بھی احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتا مگر اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔
هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ ۔ کیا احسان کے بدلے میں سوائے احسان کے بدلے کے اور بھی کوئی صورت ہے۔ کہ حساب برابر کیا جائے یعنی احسن کے عوض میں احسان کرنا لازم آتا ہے۔ اس طرح انسان پر بھی لازم ہے کہ ان احسانات کا بدلہ چکائے اب چونکہ وہ مالک الملک ہے اور انسان بدلہ چکانے کی مقدور نہیں رکھتا۔ اس کے علاوہ خدا کو اس بدلے کی ضرورت بھی نہیں یہ صرف انسان کی سعادت مندی ہے کہ اپنے مالک کے احسان یاد رکھے لہٰذا اس کا احسان اس طرح چکایا جائے گا کہ اس کی عبادت میں زیادہ سے زیادہ خلوص اور عاجزی اور گڑگڑاہٹ کا ثبوت پیش کرے اور دکھاوے ریاکاری اور منافقت سے بچے۔

۲۔ والدین سے احسان ۔ خدا کے بعد دنیا میں کسی انسان پر سب سے زیادہ احسان اور بھلائی والدین کی ہوتی ہے۔ وہ اولاد سے بے غرض اور پر خلوص محبت اور شفقت کرتے ہیں۔ ماں بچے کے لئے اس کی پرورش کے دوران میں بڑی شفقت اور محبت کا ثبوت دیتی ہے اس کے ایثار اور قربانی کی کوئی انتہا نہیں اسی طرح باپ بھی اپنے لختِ جگر سے بڑھکر اور کسی کو عزیز نہیں سمجھتا۔ اسی لئے اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا اور والدین سے احسان کیا کرو ان کی نافرمانی کی کسی صورت میں بھی اجازت نہیں بلکہ اس کی وعید بڑی سخت ہے۔ البتہ اگر والدین بے دین اور مشرک ہوں تو شرک کے معاملے میں ان کی

اطاعت نہ کی جائے اور یہ حکم ہے کہ انہیں اُف تک نہ کہو۔

۳۔ **عزیزوں اور اقرباء سے احسان**۔ اس سلسلے میں بھی کافی آیات اور احادیث ہیں کہ ہر عزیز اور قریبی رشتہ دار سے نیک اور احسان مندانہ سلوک رکھنا لازمی ہے اگر ہو سکے تو انہیں اُن کے حقوق سے زیادہ دیا جائے یہی احسان ہے۔

۴۔ ہر مالدار کے لئے غریبوں اور حاجت مندوں کی ضروریات پورا کرنا اور ان کے ساتھ احسان کرنے کا حکم ہے۔ فرمایا

وَفِیْ اَمْوَالِہِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔

اور ایمان والوں کے مال میں سے مانگنے والے اور محتاجوں کا بھی حق نکلتا ہے۔ جہاں حق کا ذکر ہے اس کے ساتھ ساتھ احسان بھی شامل کیا گیا ہے۔ محتاج کو اس کی ضرورت پوری کرنے کے بعد مزید امداد اپنا احسان ہے اگر کسی کو قرض کی ضرورت ہے تو اسے قرضِ حسنہ دیا جائے یہ بھی احسان ہوگا۔ اور مقروض کو میسّر آنے تک مُہلت دینا بھی احسان کے زمرے میں شامل ہے۔

۵۔ اسلام کی تعلیم میں دشمنوں کے ساتھ بھی احسان کرنے کا حکم ہے۔ بجائے تشدّد کے اُنہیں اخلاق اور نیکی کے ہتھیاروں سے اپنا مطیع بنایا جائے۔ اس طرح بُرائی کے بدلے میں نیکی کر کے انہیں دیکھا جائے یقیناً وہ اتنے بے مروت نہ ہونگے کہ جواب میں ہٹ دھرم ثابت ہوں۔ شاید انہیں اللہ تعالٰی صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمادے۔

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ۔ بُرائی کا بدلہ اس قسم کے نیک سلوک سے کرو کہ احسان بن جائے۔ تو تم دیکھو گے کہ جو شخص تمہارے ساتھ عداوت رکھتا ہے وہ تمہارا گہرا دوست بن گیا۔

اہلِ خانہ سے احسان۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم میں اچھا آدمی وہ ہے جو گھر والوں

کے لئے اچھا ہے۔

یعنی جو ان سے حسن سلوک سے پیش آئے اور اُن کے حقوق سے بڑھ کر مزید مہربانی کا ثبوت دے اِسی صورت سے عیال دار زندگی پرسکون اور متوازن رہ سکتی ہے کہ گھر میں افرادِ خانہ سے بہترین سلوک ہو۔ اگرچہ خدانخواستہ حالات بگڑ جائیں اور طلاق تک نوبت بھی پہنچ جائے تو پھر حکم ہے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ

یعنی طلاق صرف دو مرتبہ (قابل تنسیخ ہے) پھر یا تو دستور کے مطابق روک رکھو یا احسان کے ساتھ رخصت کر دو۔

اولاد کے ساتھ احسان بھی کہنے کے ساتھ احسان کی ضمن میں آ جاتا ہے یعنی انہیں اچھے سے اچھا کھلاؤ پہناؤ۔ ان کے لئے کمانے میں مستعدی کا اظہار کرو۔ پرورش کے دوران جو تکلیفیں پیش آئیں انھیں برداشت کرو پھر تعلیم دینی اور ضروری تعلیم دنیوی سے انہیں تہذیب یافتہ اور خوش اطوار بناؤ ان کی نیک تربیت میں کوشش کرو ان کے دل میں خدا کے احکام کو واضح کرو، انھیں نماز کی نہ صرف تاکید کرو بلکہ ثابت قدمی سے اس حکم پر قائم رہو۔

نتائج :-

۱۔ **خلوص نیت :-** احسان خلوص نیت پیدا کرتا ہے اور اس کا اجر رضائے الٰہی ہے۔ اور اس طرح احسان اللہ تعالٰے کی رضامندی کے حصول کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے۔

۲۔ **جذبۂ ایثار-** یہ ایثار کا جذبہ پیدا کرتا ہے دوسروں کے لئے قربانی کا جذبہ نہایت قابل جذبہ ہے اسی جذبہ سے قوموں کی زندگی میں نکھار اور حسن پیدا ہوتا ہے۔

۳۔ اس سے عداوت اور دشمنی کم ہو کر خیالات اور تعلقات میں خوش گواری پیدا ہوتی ہے۔ قرآن پاک کے ارشاد کے مطابق برائی کا بدلہ بھلائی کی صورت میں ادا کرنے سے دوستی کو فروغ ہوتا ہے اور قوموں کے تعلقات میں استواری کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ بجائے دشمنی کے دوستی اور خیرسگالی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

: صلاح احوال کا ایک موثر ذریعہ ہے بگڑے ہوئے خانگی اور معاشرتی حالات میں درستی اور اصلاح کی طرف میلان بڑھتا ہے اور گھر میں یا معاشرے میں بدامنی اور انتشار کی جگہ اتحاد و یگانگت کے سے حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔
اس طرح کے اور بھی کئی طرح کے بہترین نتائج احسان کے جذبات کے اظہار سے پیدا ہوتے ہیں، جس کا عملی مظاہرہ کرنے کے لئے احسان کو اپنا شعار بنانا اشد ضروری ہے۔

باب (۱۲)

خدمتِ خلق

انسان فطری طور پر ایک دوسرے سے مل جل کر اپنا رہنا سہنا پسند کرتا ہے اس کی فطرت کو تنہائی یا رہبانیت کبھی راس نہیں آتی - اس اسلام میں جو دینِ فطرت ہے ابنائے ملت سے رابطہ و ضبط قائم کرنے پر زور دیا ہے چنانچہ ہر وہ عمل جو انفرادی حالت میں کیا جائے اگر اسے اجتماعی شکل دے دی جائے تو اس کا نہ صرف وقار بڑھ جاتا ہے - بلکہ معاشرہ میں یک جہتی اور انسانیت سے میل ملاپ کے جذبات میں ترقی اور حسن پیدا ہو جاتا ہے -

خدمتِ خلق سے مراد صرف عالم انسانیت کی خدمت ہی نہیں بلکہ انسانوں کے علاوہ باقی مخلوق کی خدمت اور موانست ہے ایک انسان کے دوسرے انسان کے ساتھ متعدد تعلقات قائم ہونے سے انسان کے ذمے کچھ فرائض بھی عائد ہوتے ہیں اور کچھ حقوق کا حق دار بھی ہو جاتا ہے - جو ایک انسان کے دوسرے پر حقوق ہیں وہی دوسرے انسان کے فرائض قرار دئے جا سکتے ہیں مثلاً زید کا جو حق بکر کے ذمے ہے وہ بکر کا فرض ہے اور جو بکر کا حق زید کے ذمے ہے وہ بکر کا فرض ہے - اسی طرح انسان حقوق و فرائض میں ایک دوسرے سے مختلف نوع کے تعلقات رکھنے پر مجبور ہے -

لیکن حقوق و فرائض کے علاوہ عمومی شکل میں دینِ فطرت نے ایک انسان کے لئے عام مخلوق کی خدمت کے فرائض بھی عائد کر دئے ہیں -

ان خدمات کی تفصیل بیان کی جائے سے پہلے ضروری ہے کہ ان کی اہمیت واضح کر دی جائے۔

اہمیت :-

۱- مذاہب عالم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مذاہب میں انسانی زندگی کا مقصد محض خدمت خلق ہے۔ لیکن اسلام میں ایسا نہیں اس میں خدمت خلق لازمی فرد ہے اور نیکی کی تکمیل کے بغیر ممکن نہیں، لیکن اسلام میں نیکی محض خدمت خلق کا نام نہیں البتہ ایک اہم جزو ہے۔

۲- قرآن میں اُمت مسلم کو خیر اُمت کا لقب دیا گیا ہے اور فرمایا ہے۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔

تم بہترین اُمت ہو جو لوگوں کی بھلائی کے لئے پیدا کئے گئے ہو۔

گویا اس اُمت کی بہتری کا ثبوت یہ ہے کہ اسے لوگوں کی بھلائی مقصود ہے اور اس کا کام لوگوں کی رہنمائی کرتے ہوئے خدا کے دین کی طرف بلانا اور نیکی کو پھیلانا اور بدی کی روک تھام کرنا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری ہے۔

تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ

تم لوگوں کو اچھے لائحہ عمل کی طرف بلاؤ اور نیکی کی ترغیب دو برے راستہ سے بند کرو یعنی بُرائی اور بد امنی کا سدِ باب کرو اور اللہ پر ایمان مضبوط رکھو۔

یقیناً یہ امر معروف اور نہی عن المنکر اسی وقت ایک مسلمان کی زندگی کا دستور عمل بن سکتا ہے جب وہ خود بھی اللہ پر ایمان لائے اور نہ صرف ایمان ہی لائے بلکہ راسخ اور پختہ ایمان کی دولت سے مالا مال ہو۔

۳- انسانوں سے سب سے بڑی نیکی اسے نیکی کی ترغیب صراط مستقیم پر چلنے کی دعوت اور بُرے اور شیطانی راستوں سے روکنا ہے جن پر چل کر ایک انسان خسر الدنیا والاخرۃ کا مستحق بن جاتا ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ یہ تبلیغ اسلام اور اشاعت دین حقہ اور دین قیم کو لوگوں کے دلوں میں راسخ کرنے کی مہم صرف انبیاء کا کام تھا تمام انبیاء دین فطرت پر یعنی اسلام پر پیدا کئے گئے تھے

اور دعوتِ اسلام ہی ان کے پیشِ نظر تھا۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پر چونکہ نبوت ختم ہو گئی اس لئے یہ دعوت و تبلیغ دین کا کام علمائے صلحائے امت کے ذمے قرار پایا بلکہ ہر مسلمان کا یہ فرض قرار دیا گیا کہ اسے جو بھی معلوم ہے اسے لوگوں تک پہنچائے۔ حضورؐ کی حدیث ہے عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْل ۔ یعنی میری اُمت کے علما بنی اسرائیل کے انبیا کی طرح ہیں۔

۴۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

مَنْ کَانَ فِیْ حَاجَةِ اَخِیْهِ کَانَ اللّٰهُ فِیْ حَاجَتِهٖ ۔ یعنی جو اپنے بھائی کی حاجت اور ضروریات پوری کرتا ہے۔ اللہ تعالےٰ اس کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔

یہاں اخیہ سے مراد اسلامی برادری کے رکن ہیں ہر مسلمان ایک دوسرے کا بھائی ہے۔ دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہونا اور تعزیت کرنا بیمار کی بیمار پرسی، بیکسوں کی امداد اور حاجت مندوں کی حاجت روائی یہ سب خدمت خلق کی مختلف اشکال ہیں۔

اسلام نے بڑی شرح و تفصیل سے یہ احکام مسلمانوں کے لئے بنائے ہیں۔

خدمتِ خلق کی مثالیں۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری زندگی خدمتِ خلق کا بہترین نمونہ تھی۔ آپ کی سب سے اہم خدمت دعوتِ اسلام تھی جس کے لئے آپ ان تھک اور مسلسل اور نہایت استقلال اور صبر سے مساعی کیا کرتے تھے۔ ہر طرح کے مصائب اور تکلیفیں برداشت کرتے لیکن اپنی صراطِ مستقیم سے انحراف نہ کیا کرتے اور نہ ہی کسی مخالفت یا دشمنی یا تکلیف سے اکتا کر اپنے کام سے پہلو تہی فرماتے۔ اس کے علاوہ آپ غریبوں اور بے کسوں اور کمزوروں کی اعانت کرنے میں پیش پیش رہا کرتے مدینہ منورہ میں غریب لونڈیاں آپ کے پاس آکر جب کسی کام کرنے کی کوشش کی تو آپ اسی وقت اٹھ کر وہ کام کر آتے۔ حضرت جنابؓ کے گھر روزانہ جاتے اور بکریوں کا دودھ دوھ کر

آتے کیونکہ ان کے گھر میں اس کام کے لئے کوئی مرد نہ تھا۔

ایک دفعہ ایک پاگل لونڈی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آپ کا دست مبارک پکڑ لیا آپ نے فرمایا اے عورت مدینہ کی جس گلی میں تو چاہے میں تیرے ساتھ چلتا ہوں، چنانچہ آپ اس کے ساتھ چلے اور اس کا کام کر دیا۔

اور پھر جو حضورؐ کی سُنت کے عاشق تھے بھلا اس طرزِ عمل سے کس طرح پھر سکتے تھے صحابہ کرام کی زندگیاں بھی خدمتِ خلق کے لئے وقف تھیں۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جب خلافت کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھایا تو ایک لڑکی مغموم نظر آنے لگی۔ آپ خلافت سے پہلے اس کے گھر جاکر اس کی بکریوں کا دودھ دوھ دیا کرتے تھے، وہ غم زدہ ہو کر کہنے لگی کہ اب ہماری بکریاں کون دوہا کرے گا جب آپ کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ تو غم نہ کر میں اب بھی آکر تمہارے گھر بکریوں کو دودھ دیا کروں گا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ خلافت تو اسلامی تاریخ میں سُنہری حروف میں لکھا جانے والا زمانہ تھا۔ لیکن خدمتِ خلق ان کا جذبہ بہت شدید تھا ان کا قول ہے سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ۔ یعنی قوم کا سردار ان کا خادم ہے۔

ایک دفعہ بیت المال کے کچھ اونٹ خارش کی بیماری میں مبتلا ہو گئے آپ انہیں خود تیل مل رہے تھے کہ ایک غلام نے کہا یا امیر المومنین یہ خدمت میرے سُپرد کر دیجیے۔ آپ نے فرمایا۔ یہ میرا ہی فرض ہے۔ اور میں ہی اسے انجام دوں گا۔

آپ راتوں میں شہر اور گردو نواح کی گردش کرتے تھے اور بھیس بدل کر مختلف حالات کا جائزہ لیتے تھے ایک دفعہ ایک بڑھیا کے خیمہ کے قریب آپ کا گذر ہوا وہاں سے کچھ بچوں کے رونے اور چیخنے کی آوازیں سُنائی دیں۔ اور محسوس کیا کہ ان کی والدہ ہنڈیا پکا رہی ہے۔

آپ نے دروازہ کھل وایا۔ اور اندر جاکر بڑھیا سے بچوں کے رونے کا باعث پوچھا اور پوچھا کہ ہنڈیا میں کیا پک رہا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میرا شوہر یعنی ان بچوں کا والد

فوت ہوگیا ہے اور بچے بھوک کی وجہ سے رو رہے ہیں۔ ہنڈیا میں چند کنکریاں ڈال کر ان کو بہلا رہی ہوں، تاکہ یہ رو رو کر سو جائیں۔ حضرت عمرؓ کے آنسو نکل آئے آپ اسی وقت اُٹھے بیت المال کی طرف گئے وہاں سے کچھ آٹا اور کچھ گھی اور شکر وغیرہ کی آٹے کی بوری آپ نے اپنے کندھے پر اٹھائی۔ غلام نے کہا "یا امیر المومنینؓ یہ مجھے دے دیں، میں اٹھا لیتا ہوں۔ فرمانے لگے۔

نہیں؛ اسے میں ہی اُٹھاؤں گا، اس جگہ تو تم میرا بوجھ اٹھا لوگے کل قیامت کے دن میرے اعمال کا بوجھ کون اُٹھائے گا۔ جب یہ اشیاء لیکر آپ اس بڑھیا کے خیمہ میں آئے تو بچے سو چکے تھے آپ نے خود آگ جلائی اور آٹا گھی وغیرہ پکا کر حلوہ بنایا پھر بچوں کو اُٹھا کر انہیں کھلایا۔ بڑھیا نے بڑی دعائیں دیں اسے معلوم نہ تھا کہ یہ خلیفۂ وقت ہیں۔ وہ کہنے لگی کہ تم جیسا نیک اور خدا ترس آدمی خلیفہ بننے کا حق دار ہے۔ بعد میں اسے بتایا گیا کہ خلیفہ یہی ہیں تو نہایت خوش ہوئی۔

حضرت عثمانؓ نے بئر رومہ (ایک کنوئیں کا نام) کو خرید کر مسلمانوں کے لئے وقف کر دیا تھا یہ مدینہ میں ایک ایسا کنواں تھا جس کا پانی بہت میٹھا تھا لیکن اس کا مالک ایک یہودی تھا اس نے پہلے تو فروخت کرنے سے انکار کر دیا پھر جب زیادہ مجبور کیا گیا تو آٹھ دس گنا قیمت طلب کی جو حضرت عثمانؓ نے ادا کر دی اور کنواں اہل اسلام کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ اس سے پہلے اس کنوئیں سے کسی مسلمان کو پانی پینے کی اجازت نہ تھی۔ اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تمام زندگی اہل اسلام کے لئے وقف تھی۔ خود جناب علیؓ کی گذر اوقات فقر و فاقہ اور عسرت کی زندگی پر مشتمل تھی۔ لیکن آپ اس زندگی پر نہ صرف خوش تھے بلکہ نازاں تھے خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی آپؓ کے سامنے تھی حضورؐ کا ارشاد "الفقر فخری" ہی جناب علی کرم اللہ وجہہ کا معیار تھا، گویا حضرت علیؓ حضورؐ ہی کی زندگی کا نمونہ تھے۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا آپؓ نے رسول مقبولؐ کے گھر پر پرورش پائی تھی اور حضورؐ ہی کی دامادی کا شرف آپؓ کو حاصل تھا۔

خلفائے راشدین کے علاوہ صحابہ تابعین اور تبع تابعین بھی جن کے متعلق حضور ؐ کا ارشاد ہے۔

خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ

یعنی سب سے بہتر زمانہ میرا ہے اس میں صحابہ کرام بھی آجاتے ہیں پھر ان لوگوں کا جو ان سے ملے ہوئے ہیں یعنی تابعی پھر ان کا جو ان سے ملے ہوئے ہیں۔ یعنی تبع تابعین۔ خدمت خلق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے مطابق نہایت سرگرمی دکھاتے تھے اور ان کے بعد صلحائے اُمت اور اکابر ملت اور ائمہ و مشائخ سب کے سب اسی جذبہ سے سرشار تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اہل کی ہر علمی و عملی سرگرمیاں اسی جذبہ کے مرہونِ منت تھیں۔

علم و فنون کی ترقی کا مقصد بھی انسان کی زیادہ سے زیادہ خدمت خلق رہی تھی جو خلفائے بنی اُمیہ اور خلفائے بنی عباس اور دوسرے اسلامی ممالک کے صاحب اقتدار سلاطین کے زمانوں میں ایک درخشاں اور نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اور دُنیا نے ترفع تنعم اور خوش حالی اور فارغ البالی اور امن و امان اور سکون کے جو نظارے اہل اسلام کے عروج کے دور میں دیکھے پھر کبھی دکھائی نہیں دئے۔ کیا یہ خوش حالی اور امن و امان خدمت خلق نہ تھی، حد یہ ہے کہ غیر مسلم تک مسلمان سلاطین پر اپنی جانیں نچھاور کرنے پر بخوشی آمادہ تھے آپ نے دولت مغلیہ کے سنہری دور کا شہرہ ضرور سنا ہوگا بڑے تعجب کی بات ہے کہ متعصب مورخین کے دست برد اور توڑ مروڑ کر واقعات کو کچھ کا کچھ بنا لینے کے باوجود اس سنہری دور کو مدھم کرنے میں اُن دشمنوں کی کوششیں ناکام کیوں ہوگئیں اگرچہ متعصب اور اسلام دشمن مورخ ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے کیونکہ اسلام دشمنی ان کی گھٹی میں پڑی تھی بچھو اپنا ڈنک چلانے سے کس طرح باز رہ سکتا ہے۔ لیکن خدا کی مہربانی ہے کہ وہ باوجود پوری کوشش کے شاہ جہاں عالمگیر، اکبر اور جہانگیر کے زریں عہد کو دھندلانے میں ناکام رہے اس زمانے کا امن و امان درباری شان و شوکت

ہندو مسلمانوں کا باہم شیر و شکر ہونا اور غیر مسلموں کا پورے کا پورا مطیع سلاطین بلکہ ان کا جاں نثار ہونا بلا وجہ نہ تھا، سلاطین اور مسلمان طبقہ کے دل میں بلا تمیز مذہب و ملت خدمت خلق کا جذبہ موجزن تھا اور مسلمانوں سے اس رویہ کے ردِ عمل کے طور پر ہندوؤں راجپوتوں اور غیر مسلم اقوام کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا تھا کہ اگر کوئی قوم حکومت کی اہل ہے تو وہ مسلمان ہے۔ اور یہ خیال بیجا نہ تھا حقیقت میں حکمرانی اور جہاں بانی اسی قوم کا حق ہے جو نسلِ انسانی کی فلاح و بہبود کا خاص پروگرام رکھتی ہے اور اسلام چونکہ دین فطرت ہے اور خدا کا آخری دین ہے اور ہر لحاظ سے مکمل و اکمل ہے۔ جس طرح ہر معاملہ میں انسان کی رہنمائی کرتا ہے اسی طرح سیاسی طور پر بھی اسی تعلیم اسلام کی روشنی میں کامل ترین اسباق رکھتا ہے اسی لئے وہی قوم حکومت اور جہاں بانی کی اہل قرار دی جا سکتی ہے جو زندگی کی ہمہ جہتی اور مکمل نظامِ حیات رکھتی ہو۔

اسی لئے خود ہندوؤں میں بھی ایک گروہ ایسا پیدا ہوا جو درشنی فرقہ یا گروہ کہلایا وہ شاہ پرستی میں حد سے تجاوز کر گئے ان کے خیال کے مطابق اس وقت تک وہ دنیا کا کوئی کام نہیں کر سکتے تھے جب تک وہ بادشاہ کی جبیں کو وہ خدا جانے بھگوان کا سایہ سمجھتے تھے یا کوئی دیوتا) شکل کا درشن نہ کر لیں۔ چنانچہ اکبر کے وقت سے اس فرقہ کو خوش کرنے یا سیاسی مصالح کی بنا پر دستور ہو گیا تھا کہ صبح صبح بادشاہ اپنے محل کے بالاخانہ پر ایک کھڑکی میں جس کو جھروکہ کہتے تھے آجاتا تھا اور اپنا روئے منور دکھا کر چلا جاتا تھا۔ ہندو لوگ اس صورت کو ڈنڈوت کر کے کچھ جاپ جپتے ہوئے اپنے گھروں کی راہ لیتے تھے اور روزمرہ کا کام شروع کر دیتے تھے۔ مؤرخ اس واقعہ کو سرسری طور پر بیان کر کے خاموش ہو جاتے ہیں۔ یعنی اسے کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے حالانکہ یہ رسم سو سال تک مغلیہ عہد میں جاری رہی اکبر کے وقت جہانگیر کے وقت شاہ جہاں کے وقت عرصہ دراز تک یہ رسم جاری رہی حتیٰ کہ یہ ایک معمول بن گیا کسی کو اس رسم کی ادائیگی پر تعجب نہ ہوا پھر اورنگ زیب عالمگیر سا متدین بادشاہ سریر آرائے

سلطنت ہوا اس نے رسم کی قباحت اور شرک صریح کو پہچانا اور یہ رسم بند کرادی حالانکہ اس کے مرتکب مسلمان نہیں بلکہ ہندو تھے۔ اس سے ان مسلمانوں سلاطین کی عظمت اور بے تعصبی اور انصاف و عدل اور اہلیت کا نقش گہرا ہو جاتا ہے۔

یہ تمام باتیں صرف اس لئے لکھنی ضروری ہیں کہ بتایا جائے کہ مسلمان حکمران سلاطین اور نیک صالح اشخاص اور مشائخ اسلام اور بزرگوں نے خدمت خلق کے جذبہ کو اس طرح استعمال کیا اور اس طرح اس پر خود بھی عمل کیا اور لوگوں کو بھی عمل کی تلقین کی کہ دشمن تک ان کا کلمہ پڑھنے لگے۔

محمد بن قاسمؒ کے زمانے کے واقعات سامنے رکھیں آپ نے سندھ اور ملحقات سے کفر کا زور توڑا اور سلطنت اسلام کو وسعت دی مگر اخلاق کی تلوار سے جن لوگوں نے ان کا راستہ روکنا چاہا اور مزاحم ہوئے صرف انہیں سے لڑائی ہوئی سندھ کے عوام تقریباً سو فی صد غیر مسلم تھے لیکن راجہ داہر اور اس قسم کے جابر حکمرانوں کے ظلم و ستم سے نالاں تھے۔ جب ان کو مسلمان منصف عادل اور اہل حکمرانوں سے سابقہ پڑا تو وہ مسلمان حکمرانوں کے گرویدہ ہو گئے محمد بن قاسمؒ کا تو یہ حال تھا کہ گویا وہ سندھیوں کا محبوب ہی نہیں دیوتا تھا:

جب محمد بن قاسمؒ کو حکومت بنی امیہ کے نئے حکمران کی طرف سے سندھ سے واپس بلا لیا گیا اور طرح طرح کی سزائیں دی گئیں تو سندھی خصوصاً بہت مضطرب ہوئے وہ محمد بن قاسم کے سندھ سے واپس جانے پر نالہ و فریاد کرنے لگے اور اس جذبہ نے عالمگیر ماتم کی شکل اختیار کر لی۔

حتیٰ کہ سندھی ہندوؤں نے اپنے بت خانوں میں دوسرے بتوں کے ساتھ محمد بن قاسم کا بت بھی تراشا اور اسے پوجنا شروع کر دیا (فتوح البلدان)

اور یہ تو قرون اولیٰ کے اہل اسلام یعنی صحابہ کرام کے دور کا مشہور واقعہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ کے شروع کے دور میں رومیوں نے جنگ کی تیاری بڑے پیمانہ پر شروع کر دی تو انہوں نے حکم دیا کہ جن شامی شہروں پر مسلمان قابض ہو چکے ہیں

اُن میں سے بعض سے دست بردار ہو کر فوج کو جنوب کی طرف جمع کیا جائے اس پر دمشق سے اسلامی فوجیں رخصت ہوگئیں۔ تو وہاں کے عیسائی رونے اور ماتم کرنے لگے کہتے تھے تم مسلمان ہم کو ہمارے ہم مذہب رومی حکمرانوں سے زیادہ اچھے ہو کیونکہ وہ ظالم ہیں اور تم عادل و منصف ہو خدا کے لیے یہاں سے نہ جاؤ۔ یہ تھی مسلمانوں کی خدمت خلق بلا تمیز مذہب و ملت۔ ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد خدمت خلق خود کی جائے تو اس سے بڑھ کر اور کوئی نیکی نہیں لیکن اگر خود نہ کر سکے تو بالواسطہ دوسروں کے ذریعے بھی کی جا سکتی ہے۔ خدمت خلق کا معاوضہ اگر نہ ہی لیا جائے تو بہتر ہے لیکن اگر کسی شخص کا کام ہی یہ ہے اور اسی غرض کو پورا کرنا اس کے فرائض میں مثلاً کوئی ملازم ہے جو عام لوگوں کی فلاح و بہبود کے کام کرتا ہے تو اس کا معاوضہ لینے میں کوئی حرج نہیں مگر جائز معاوضہ ہونا جائز ہرگز نہ ہو۔

یہاں ایک وضاحت طلب بات بھی ہے خدمت خلق کو خدا کا حکم سمجھ کر کرنا زیادہ نیکی اور ثواب کا باعث ہے۔ لیکن اگر محض دکھاوے، ریاکاری اور دنیا کی واہ واہ کے لئے کیا جائے تو اس کا اجر خدا کے ہاں بالکل نہ ملے گا، بلکہ غیر مخلصانہ طرز عمل کے لئے عذاب میں گرفتار کیا جائے گا اسی طرح نیکی اور احسان یا کسی خدمت کے عوض کسی کو تکلیف دینا یا کسی پر احسان جتانا ناجائز ہے اللہ فرماتے ہیں۔

لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ

یعنی اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور تکلیف دیکر ضائع نہ کرو۔

اہم سوالات

۱۔ تقویٰ کے لغوی اور اصطلاحی معنی بیان کریں اور اہلِ تقویٰ کی صفات بیان کریں۔
۲۔ ذکر کا مفہوم تحریر کریں اور اس کے مختلف طریقوں کی وضاحت کرتے ہوئے اس کے نتائج قلم بند کریں۔
۳۔ صبر کسے کہتے ہیں۔ اقسامِ صبر اور مقاماتِ صبر پر مختصر مضمون لکھیں۔
۴۔ شکر کی کیا ضرورت ہے اور کس طرح ادا کیا جاتا ہے تفصیل سے تحریر کریں۔
۵۔ اسلامی معاشرے میں عدل کا کیا مقام اور اس کے تقاضے کیا ہیں۔ واضح کریں۔
۶۔ احسان کا مفہوم لکھیں اور مقامات احسان اور مدارج احسان کی وضاحت کریں۔
۷۔ خدمتِ خلق سے کیا مراد ہے۔ اسلامی تاریخ کے حوالے سے بیان کریں کہ قرونِ اولیٰ میں اس جذبے کا غیر مسلموں پر کیا اثر پڑا اور بعد میں مسلمان سلاطین کے دور میں اس کے کیا نتائج نکلے۔

قبیل داری

ایک مسلمان کی انفرادی زندگی کے بعد زندگی کے دوسرے اجتماعی دائروں میں سے متاہلی زندگی یا قبیل داری کی زندگی کا دور قابل ذکر ہے۔ بچہ آغوشِ مادر میں ہوش سنبھالتا ہے۔ اور اسی طرح اس کی قبیل داری زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔

اس اجتماعی زندگی کے مختلف مراحل میں انسان کے ذمے گوناگوں ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں۔ ان کا تعین از روئے تعلیم اسلام کیا جانا ضروری ہے۔ سب سے پہلا مرحلہ خانگی یا متاہل زندگی کا ہے۔

جب انسان نکاح کر کے گھر کے ماحول میں داخل ہوتا ہے اور اس کی زندگی میں دو افراد ایک خاوند اور دوسری بیوی شامل ہوتے ہیں، اُس دَور کے بعد بچوں کی پیدائش ہوتی ہے اور انسان باپ یا ماں بنتی ہے۔ چنانچہ اِس عنوان کے ماتحت اُس کی ضرورت حقوق الزوجین اور اولاد اور والدین کے حقوق و فرائض کے متعلق بحث ہوگی۔

باب (۱۳)

عائلی یا متاہل زندگی کی ضرورت

فطرت کے قوانین کے مطابق زندگی گذارنے کے لئے میاں بیوی کا رشتہ عائلی زندگی کا بنیادی رشتہ ہے اور اس کی ضرورت اس لئے ہے کہ اسی کی بدولت شہر گاؤں قصبے اور ملک آباد ہیں۔ جنگلوں میں جہاں تہذیب و تمدن کا نام ونشان بھی نہیں وہاں بھی جو لوگ بستے ہیں اور مذہب و ملت کے پابند نہیں ہوتے بلکہ انہیں اس بات کا علم تک نہیں ہوتا کہ خدا کیا ہے۔ مذہب کیا ہے اور نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے وہاں بھی غیر مہذب اور نیم وحشی اقوام میں نکاح اور شادی کا سلسلہ قائم ہے۔ کیونکہ یہ ایک فطری معاملہ ہے۔ اور طبعی ضرورت ہے۔ ابتدائے آفرینش میں جب اللہ تعالےٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کر کے جنت کے باغوں میں رکھا تو وہاں بھی وہ بوجہ تنہائی کے اکتا گئے چنانچہ انہیں کے بدن کے ایک حصّے سے اماں حوّا علیہا السلام کو پیدا کیا گیا اور آدم و حوا میں انتہا سے زیادہ موانست اور محبت کا آغاز ہوا اور اس طرح دُنیا کی آبادی کی بنیاد پڑی۔ قرآن پاک میں ہے:

یٰاَیُّہَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّ خَلَقَ مِنْہَا زَوْجَہَا۔

اے لوگو اس اللہ سے ڈر کر پرہیز گار بنو جس نے تم کو ایک شخص (نفس یعنی جاندار) سے

سے پیدا کیا۔ اور اسی نفس یعنی جان دار سے اس کی بیوی بنائی۔ اور ان دونوں سے کثرت سے مرد اور عورتیں پیدا کر دیں۔

ایک اور جگہ فرمایا۔ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا۔ اللہ وہ ذات ہے جس نے تم کو ایک جاندار انسان سے پیدا کیا اور پھر اس کی بیوی بھی اسی میں سے بنائی تاکہ اس کے پاس جا کر وہ سکون اور اطمینان حاصل کرے۔

چنانچہ نکاح اور شادی انسان کی فطری ضروریات میں سے ایک اہم ضرورت ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے۔

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَائِكُمْ

اور تم میں سے جن کے نکاح نہیں ہیں ان کے نکاح کروا دیا کرو اور غلاموں اور لونڈیوں میں سے جو نکاح کی اہلیت اور صلاحیت رکھنے والے ہیں ان کے نکاح بھی کروا کروا دیا کرو۔

اپنے برگزیدہ انبیاء علیہم السّلام کی تعریف بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ بھی بیوی بچوں والے تھے۔ ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً۔ اور بیشک ہم نے بھیجے آپ سے پہلے رسول اور ان کی بیویاں بھی تھیں اور اولاد بھی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں۔ "نکاح میری سنّت ہے تو جس نے میری سنّت سے روگردانی کی وہ مسلمان نہیں"۔ ایک اور حدیث میں حضورؐ فرماتے ہیں۔ "جس نے نکاح کیا اس نے اپنا آدھا دین بچا لیا پس اُسے چاہیئے کہ دوسرے آدھے حصّے کی بھی حفاظت کرے"

ایک اور حدیث کے یہ الفاظ ہیں۔ "ابن آدمؑ کے اعمال اس کی موت کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں۔ سوائے تین چیزوں کے جن میں ایک نیک اولاد ہے۔ جو اس کے لئے دعا

کرتی رہتی ہے۔"

اور نیک اولاد نکاح ہی کا ثمرہ ہے اس سے نکاح کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ نکاح سے صرف دو چیزیں مانع ہیں۔ (۱) عجز اور دوسرے (۲) فجور۔ یعنی دین اس سے منع نہیں کرتا اس سے منع کرنے والی یہ دو چیزیں ہیں جو دین میں بھی مذموم ہیں۔

مندرجہ بالا آیات و احادیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نکاح ایک نہایت اہم اور ضروری امر ہے۔ اسلام میں اس کے متعلق بہت تاکید ہے۔ کیونکہ اسلام تجرد کی زندگی کا سخت مخالف ہے اور اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ کیونکہ مجرد آدمی کے قویٰ بوجہ غیر متاہل تجردانہ زندگی کے بیکار اور نکمے ہو جاتے ہیں اور وہ خلق خدا سے کٹ کر رہ جاتا ہے اسلام دین فطرت ہے اور ہر غیر فطری فعل اس کی رو سے ممنوع ہے۔ اسلام میں زندگی کی صلاحیتیں معاشرتی ماحول میں ہی پروان چڑھتی ہیں اور کمال کو پہنچتی ہیں اور اسی کی بدولت آدمی کی مختلف النوع حیثیتیں متعین کی جاتی ہیں اور انہی کی بنا پر وہ اپنے حقوق و فرائض کو ادا کرکے اپنے آپ کو اجتماعی زندگی میں ایک مفید اور فعال رکن ثابت کرتا ہے۔ رسولوں کی زندگی کا متاہل ہونا قرآن کی رو سے ثابت کیا گیا ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ رسول اپنی اُمتوں کے لئے ایک کامل انسان اور قابل تقلید حیثیت سے سامنے آتے ہیں اور عوام کو ان کی تقلید کرنا لازم ہوتا ہے۔

نکاح کی افادیت :-

نکاح کی اہمیت اور ضرورت کے مطابق اس سے مُرتب ہونے والے فوائد بھی اتنے اہم ہیں کہ انہیں نکاح کے مقاصد بھی قرار دے سکتے ہیں۔ مختصر طور پر وہ مندرج ذیل ہیں۔

۱۔ بقائے نسلِ انسانی :- فطرت کا یہ مقصد ہے کہ دُنیا نسل انسانی سے خالی نہ رہے۔ اس مقصد کے تحت اللہ تعالےٰ نے مرد عورت کا جوڑا بنایا ہے نہ مرد عورت کے بغیر گذر اوقات کر سکتا ہے اور نہ عورت مرد کے بغیر دُنیا میں کسی کام کی ہے۔ خداوند کریم نے انسانی جسم میں ایسی خواہشات پیدا کی ہیں کہ مرد اور عورت الگ الگ

رہ بھی نہیں سکتے اور انسانی نسل کے علاوہ خدا نے حیوان اور نباتات میں بھی نر مادہ بنائے ہیں کہ وہ توالد و تناسل کا سبب بنیں اور دُنیا میں پھلیں پھولیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں کہ عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں جس طرح کھیت میں بیج ڈال کر اور زمین میں محنت کر کے ایک زمیندار غلہ اور پھل وغیرہ حاصل کرتا ہے اسی طرح عورت سے تمتع حاصل کر کے انسانی نسل کی برقراری اور زیادتی اور نشو و نما کا سلسلہ قائم کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ اگر چاہتے تو مرد عورت کی خلوت کے بغیر بھی نسل انسانی کی بقا قائم رکھنے کے لئے اور کوئی طریقے بنا دیتے۔ لیکن اس طرح خانگی اور متاہل زندگی جو ایک فطری امر ہے اس کا چلن نہ ہو سکتا اور دُنیا بے کیف سی معلوم ہوتی۔ چنانچہ نسل انسانی کی بقا نکاح کے فائیدوں میں سے ایک بڑا فائیدہ ہے۔

ل۔ مالکِ حقیقی کی محبّت :- اس کی مثال یوں ہے کہ اگر کوئی مالک اپنے خادم کو اعلیٰ بیج مہیا کرتا ہے، آلات، زراعت دیتا ہے اور دوسری ضروریات بہم پہنچاتا ہے تو اگر خادم اِن اشیاء کا جائز استعمال کر کے غلہ اُگاتا ہے اور زمین میں محنت کرتا ہے تو اس سے مالک بہت خوش ہوتا ہے اور اگر یونہی وقت اور سرمایہ اور اسباب وغیرہ ضائع کر دیتا ہے اور کوئی صحیح کام نہیں کرتا تو اس سے نہ صرف خادم نقصان اُٹھاتا ہے، مفلسی اور تنگ دستی کا شکار ہوتا ہے بلکہ مالک بھی اس سے ناراض ہو کر اس سے کو دیا ہوا مال اسباب اس سے چھین لیتا ہے اور سزا دیتا ہے۔ یہی حال نکاح کا ہے، نکاح کر کے اولاد صالح پیدا کرنا انہیں مناسب اور صحیح تربیت دینا اور معاشرہ کے لئے مُفید بنانا ہر اُس شخص کا کام ہے جو فطرت صحیحہ پر پیدا ہوا اور اعمال صالح کئے۔

اس سے نہ صرف اسے ایک پُر مسرت اور خوشیوں بھرا کُنبہ ملتا ہے اس کا نام باقی رہتا ہے اور انسانی نسل کا بقا ہوتا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ بھی راضی ہوتے ہیں۔ اسی لئے اولاد کا قتل اور لڑکیوں کو زندہ دَر گور کرنے کی سخت وعید آئی ہے اور اسے ناقابلِ معافی جُرم قرار دیا ہے۔

(ب) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا حصول :۔ حضور فرماتے ہیں کہ نکاح کرو اور اولاد کثرت سے پیدا کرو، تاکہ قیامت کے دن میں دوسری اُمتوں پر تمہاری کثرت پر فخر کر سکوں یعنی حضورؐ اس امر کو بہت پسند کیا کرتے تھے۔

(ج) نیک اولاد موجب خیر ہے ۔ حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ انسان کے اعمال کا سلسلہ موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے لیکن اگر نیک اولاد چھوڑ جائے تو وہ اس کے لئے قیامت تک دُعائے خیر کرتی رہے گی۔ اور باقیات الصالحات بنے گی۔

(د) اور اگر بچہ اس سے پہلے بچپن میں مر جائے تو وہ والدین کے لئے قیامت کے روز شفاعت کرے گا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ بچے اپنے والدین کو جنت کی طرف کھینچیں گے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ جب بچے کو جو چھوٹی عمر میں مر چکا ہوگا، کہا جائے گا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ تو وہ جنت کے دروازے میں کھڑا ہو جائے گا۔ اور بہت غصے میں ہوگا اور کہے گا کہ میں اس وقت تک داخل نہیں ہونگا جب تک میرے والدین میرے ساتھ نہ ہوں۔ تو خدا کی طرف حکم ہوگا کہ اس کے ساتھ اس کے والدین کو بھی جنت میں داخل کر دو۔ یعنی نیک اولاد چھوٹی ہو یا بڑی ہر حالت میں انسان کی نجات کا باعث ہے۔ لہٰذا نکاح کے فوائد میں سے یہ ایک بڑا فائدہ ہے کہ دونوں میاں بیوی مل کر بچے کی پرورش اور تربیت کریں تمام حیوانات میں سے انسان کے بچے کی پرورش سب سے مشکل ہے۔ اسی لئے اس کے ثمرات بڑے شیریں ہیں والدین کا فرض ہے کہ اولاد کو ہر طرح کی سہولت اور آسائش میسر کریں اور اس طرح اولاد بڑی ہو کر نوع انسانی کو باقی رکھے اور خدا کی مشیت پوری ہو۔

۲۔ پاک دامنی اور عصمت :۔ ایک منضبط معاشرہ میں اور با اصول اور خدا کی فطرت کے مطابق زندگی بسر کرنے والے گروہوں میں ہر چیز اور ہر جذبہ کو پورا کرنے پر جائز پابندیاں خدا کی طرف سے عائد کی گئی ہیں۔ شہوت اور نفسانی خواہش بھی ایک

جذبہ ہے جس کا یہ تقاضا ہے کہ ہر مرد اپنی ہم جنسی سے زناشوئی کے تعلقات قائم کرلے اور اگر وہ منشائے الٰہی اور حکم خداوندی کے تحت ہوں اس سے معاشرہ میں عصمت وعفت کی حفاظت اور پاکدامنی پھیلتی ہے اور اگر مغربی تہذیب کے علم برداروں کے پھیلائے ہوئے بے قید اور غیر منضبط ذرائع استعمال کریں تو اس کے معاشرہ میں بے غیرتی انتشار اور بدامنی اور قتل وغارت اور اخلاقی بے راہ روی کو ہوا ملتی ہے۔ اور بالآخر معاشرہ اور ملک کی تباہی کا سبب بنتی ہے۔ پہلی صورت انسانیت اور آدمیت اور فطرت اور اسلام کے قریب ہے اور دوسری صورت بہیمیت اور حیوانیت اور غیر انسانی معاشرہ پر مبنی ہے اس کا ارتکاب کرنے والے حیوانوں سے بڑھ کر ذلیل اور پست فطرت ہیں۔

شہوت کے جذبہ کی تہذیب وتعدیل کو اللہ تعالےٰ نے نکاح کو واجب قرار دیا ہے تاکہ اس بندھن اور عقد کے ذریعے میاں بیوی بن کر رہ سکیں۔ اسی وجہ فرمایا

لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا۔

زنا یا بدکاری کے قریب بھی نہ پھٹکو۔ بیشک وہ فحش کام ہے اور نہایت بُرا ہے اور قبیح راستہ ہے۔ گویا نکاح مرد عورت کی عصمت اور پاکدامنی کا ضامن ہے۔ نیز نکاح کے لئے اللہ تعالےٰ نے قرآنِ پاک میں لفظ احصان بھی استعمال کیا ہے جو حصن سے مشتق ہے جس کے معنی قلعہ کے ہیں تو احصان کا معنی ہوا قلعہ بند کرنا مرد کو قرآن مجید نے محصن اور عورت کو محصنہ کہا ہے یعنی مرد نکاح کے ذریعہ ایک قلعہ تیار کرتا ہے اور عورت کو اس میں داخل کرکے اسے ہر خطرے سے محفوظ کردیتا ہے مرد اس کی حفاظت کی پوری ذمہ داری اپنے ذمہ لے لیتا ہے اور اس طرح یہ جبلی تقاضا اسلام کی مرضی کے مطابق پورا ہوتا ہے۔ اور اسے کوئی غلط یا ناجائز راستہ تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی ایک حدیث میں ہے۔

"اے نوجوانو تم میں سے جو مہر اور نان نفقہ کی طاقت رکھتے ہیں وہ نکاح کریں کیونکہ اسی سے نگاہ پاک رہتی ہے اور اخلاق کی حفاظت ہوتی ہے۔

اور جو طاقت نہ رکھتا ہو اسے چاہیئے کہ روزے رکھے۔

ایک اور حدیث میں ہے" جب کوئی مسلمان نکاح کرتا ہے تو شیطان چیخ اُٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کا بُرا ہو۔ اس نے مجھ سے دو تہائی دین بچا لیا۔"

الغرض نکاح شہوت کے زور کو توڑ دیتا ہے اور اس کو اعتدال پر ڈال دیتا ہے اور فریقین کی عصمت اور پاک دامنی کا باعث بنتا ہے۔

۳۔ تدبیر منزل۔ گھریلو کام کاج زیادہ تر عورتوں پر منحصر ہوتے ہیں خانگی امور اگر مردوں کو انجام دینے پڑیں تو زندگی تلخ ہو جائے فطری تقسیم کار کا بھی تقاضا ہے کہ مرد باہر کے کام کاج میں مصروف ہوں تجارت صنعت و حرفت ملازمت زمینداری وغیرہ تمام امور مردوں کے لئے وقف ہوں اور عورتوں کے ذمے خانہ داری کے تمام امور ہوں۔ وہ گھر کی چار دیواری میں مکمل آزادی اور خود مختاری اختیار کر کے مرد کا کام بانٹ لے تاکہ مرد اپنے مفوضہ امور پر پوری طرح توجہ دے سکے۔ اور وہ دُنیا و دین کے جملہ کام میں فراغت سے کام کر سکے۔

بزرگوں کا قول ہے " نیک بیوی دُنیا کی مخلوق میں سے نہیں ہوتی کیونکہ وہ تجھے آخرت کے لئے فارغ کر دیتی ہے"۔ اور یہ فراغت تدبیر منزل ہی سے حاصل ہوتی ہے۔

۴۔ اسباب راحت نفس۔ قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً ۔ اور خدا کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تم میں سے بیویاں بنا دیں تاکہ تم ان سے سکون اور راحت حاصل کرو اور تم میں باہم محبت اور مہربانی کی بنا رکھی۔

یعنی بیوی مرد کے سکون اور آرام کا باعث ہوتی ہے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ " اس سے انسان کو خدا کی عبادت کے لئے مزید تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے بغیر عبادت کرتے کرتے طبیعت میں ملال اور اکتاہٹ پیدا

ہو جاتی ہے۔" اسی لئے حضرت علیؓ فرماتے ہیں۔" کچھ وقت کے لئے اپنے دلوں کی راحت کا سامان بھی مہیا کیا کرو کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جائے بلکہ ہر وقت انہیں ایک ہی کام پر مجبور کیا جائے تو دل اندھے ہو جاتے ہیں۔"

۵۔ احساس ذمہ داری اور مجاہدہ دریاضت :۔ نکاح کرنے سے انسان پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں۔ مثلاً بیوی نے نان نفقہ کا انتظام اس کے جملہ حقوق کی ادائیگی اس کے اخلاق و عادات کی برداشت اس کی اصلاح کی کوشش ہدایت دین۔ کسب حلال تربیت اولاد وغیرہ یہ تمام امور اس میں ایک ایسا احساس پیدا کرتے ہیں، جو تجرد کی حالت میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور یہ احساس اس کو عمل پر آمادہ کرتا ہے۔ وہ بے کاری اور کاہلی کو خیرباد کر دیتا ہے اور اس طرح وہ معاشرے کا ایک فعال اور مفید رکن بن جاتا ہے۔ جدوجہد سعی پیہم اور ریاضت اس کی عادت بن جاتی ہے۔

وہ اپنی چھوٹی سی ریاست کا نگران اعلیٰ بن جاتا ہے جس میں اس کی بیوی مشیر کا کام کرتی ہے۔ اور اولاد رعایا کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اور یہ تمام ارکانِ مشیرہ (کنبہ) اپنے اپنے فرائض سے اس نظریہ کے ماتحت عہدہ برآ ہوتے ہیں یہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے۔

حضورؐ کا ارشاد ہے۔ کُلُّکُمْ رَاعٍ وَّکُلُّکُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَّعِیَّتِہٖ

یعنی تم میں ہر شخص راعی ہے اور ہر ایک سے اپنی رعایا کے متعلق باز پرس ہوگی۔

اس سلسلہ میں تربیت اولاد کی ذمہ داری بالخصوص سامنے آتی ہے۔ یہ فریضہ مرد اور عورت دونوں پر عائد ہوتا ہے، اور صرف والدین اس سے صحیح طور پر عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ ماں کی گود اور پھر گھریلو ماحول بچے کا پہلا سکول یا مکتب ہے۔ اس سے وہ جو کچھ سیکھتا ہے اس کا اثر تمام عمر اس کی طبیعت پر رہتا ہے علمائے نفسیات نے اسی چھ سات کی عمر کو تربیت میں خاص اہمیت دی ہے۔ وہ کہتے ہیں بچہ جو اس طفولیت کے عہد میں جو کچھ سیکھ لیتا ہے وہ اس کی عادتِ ثانیہ بن جاتا ہے۔ اس لئے دس برس سے پہلے کے بچے کے لئے یہ ماحول

اللہ کی مرضی اور حکم کے تحت بڑا کارآمد بنانا تمام والدین پر لازمی ہے۔ تاکہ بڑا ہو کر وہ نہ صرف اچھا شہری بنے بلکہ نہایت فعال اور کارآمد ثابت ہو۔ پرورش کے ساتھ ساتھ والدین اس کی فطری تربیت اور تہذیب اخلاق سے بھی غافل نہ ہوں۔ ورنہ حدیث مذکورہ بالا کے مطابق انہیں کل خدا کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے گا۔ اور والدین بچے کی محبت کے فطری تقاضے ہی کی بناء پر اس کی تربیت کو اعلیٰ اور پسندیدہ رنگ دے سکتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ نکاح ایک ضرورت شرعی ہے جس پر بہت سے فوائد مترتب ہوتے ہیں جو ایک پُرسکون اور فطری زندگی کے لئے ناگزیر ہیں۔ اور وہ عائلی زندگی کی اہمیت پر دلالت کرتے ہیں۔

اب ضرورت ہے کہ تعلقِ نکاح کی وجہ سے جو رشتہ داریاں وجود میں آتی ہیں۔ ان کی بناء پر ان حقوق و فرائض کا تعین کیا جائے جو اسلام کے مقرر کردہ ہیں۔ اور جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

تین قسم کی رشتہ داریاں ظہور میں آتی ہیں یعنی زوجین والدین۔ اور اولاد۔ چنانچہ اسی ترتیب سے ان کا مختصر جائزہ پیش کیا جائے گا۔

حقوق الزوجین

زوجین تثنیہ کا صیغہ ہے اس کے معنی ہیں جوڑا یا دو فریق۔ ان میں سے ایک مرد اور دوسری عورت مراد ہیں۔ یعنی وہ میاں بیوی جن کے درمیان مناکحت کا رشتہ قائم ہو چکا ہے۔ جس زمانے میں اسلام ان کے حقوق کا تعین کر رہا تھا اس زمانہ کی تاریخ کا مطالعہ یہ حقیقت واضح کرتا ہے کہ عورت کی حیثیت مطلقاً کچھ بھی نہ تھی۔ اسے جانوروں یا مالِ متاع سے بڑھ کر نہیں سمجھا جاتا تھا، ہندوستان میں یہ رواج تھا کہ عورت کو گھر میں مرد کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غلام بن کر رہنا ہوتا تھا۔ اکثر خاوند کی وفات کے بعد اسے بھی مرد کے ساتھ جلا دیا جاتا تھا۔ بدھ مت اور عیسائیوں میں تجرد اور رہبانیت کے تصور کا غلبہ تھا۔

ان دونوں مذاہب میں عورت کی طرف دھیان کرنا یا اس سے کوئی اچھا سلوک کرنا یا اسے کوئی اہمیت دینا گناہ تھا۔ کیونکہ یہ ایک دُنیا کی چیز تھی اور ترک دنیا کا سا عقیدہ رکھنے والے اس کے حقوق کا کس طرح خیال کر سکتے تھے۔ عورت کو نفرت وحقارت کا ہدف بنایا جاتا تھا۔ عربوں میں عورت صرف ڈھور ڈنگر کی حیثیت رکھتی تھی۔ بعض قبائل میں جھوٹی غیرت کا تقاضا یہ تھا کہ لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا تاکہ کوئی ان کا داماد نہ بنے غرض عورت سے عموماً غیر انسانی سلوک روا رکھا جاتا تھا۔

لیکن یہ تو اس زمانہ کی بات ہے جب تکمیل انسانیت کے لئے دنیا میں کوئی مصلح اور پیغمبر نہیں بھیجا گیا تھا اور اگر پہلے اوقات میں پیغمبر آئے بھی تھے تو ان کی تعلیم ہی کہیں جاری و ساری نہ تھی۔ خدا کا پیغام بالکل بھلایا جا چکا تھا۔ لیکن دین فطرت کی تکمیل کے لئے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری نے عورت کا درجہ بلند کر دیا حکم خداوندی ہے۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ۔ عورتوں کے حقوق بھی مردوں پر اسی طرح ہیں۔ جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں کے ذمے ہیں۔

اس نے انہیں جائداد کا وارث اور مالک ٹھیرایا۔ قرآن مجید میں ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ۔

مردوں کے لئے حصہ ہے اس میں جو وہ کمائیں اور عورتوں کے لئے حصہ ہے اس میں جو وہ کمائیں۔

لیکن انتظامی امور کے پیشِ نظر اور فطری تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے مرد کو عورت پر ایک گونہ فضیلت اور برتری عنایت کر دی تاکہ خانگی امور میں اسے فضیلت اور حاکمیت حاصل رہے ظاہر ہے کہ اگر دونوں فریق یعنی مرد عورت کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جاتا جس طرح کہ آجکل تہذیب نو کے دعویدار ہانک رہے ہیں تو معاشرہ میں وہی انتشار اور بدمزگی پھیلتی جو ایک غیر فطری اور ناہموار معاشرے کی صورت میں یورپین ملکوں میں سر اٹھا رہی ہے۔ یورپین تہذیب مرد اور عورت میں مساوات کے دعویدار ہیں۔ یہ مساوات غیر فطری ہے اور اس طرز عمل سے کئی طرح کی خرابیاں اور انتشار اور معاشرتی ناہمواری کی بنیاد پڑتی ہے۔ اگر کسی گھر میں مرد و عورت

دونوں اپنے آپ کو حاکم قرار دیں تو اس طرح زندگی اجیرن اور گھر کا امن وسکون ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ کیونکہ حاکمیت صرف ایک ہی ہستی کو حاصل ہو سکتی ہے مرد بوجہ فطری صلاحیتوں کے حاکم ہونے کا زیادہ حق دار ہے اور عام مشاہدہ ہے کہ اگر گھر میں مرد محکوم اور عورت حاکم بن جائے تو اس صورت میں سوائے فساد اور جھگڑے اور انتشار کے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا اور پھر بچوں کا مستقبل تاریک ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کا کوئی حکم اور قانون حکمت سے خالی نہیں۔ اسی لئے فرمایا۔ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ اور عورتوں پر مردوں کو فوقیت حاصل ہے۔

دوسرے مقام پر فرمایا۔

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ وَبِمَا أَنفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ ۔ مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس وجہ سے کہ اللہ تعالےٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ اور اس وجہ سے وہ یعنی مرد اپنے مال میں سے خرچ کرتے ہیں۔

مرد کماتا ہے اور عورت اور بچے مرد کی کمائی کھاتے ہیں یہی اصول فطری اور معاشرتی ہیں۔ اسی لئے مرد کا درجہ عورت سے اعلیٰ ہے اور فوقیت رکھتا ہے۔ لیکن حقوق کے معاملے میں عورت مساوات کا حق رکھتی ہے۔

اخلاقی حیثیت سے ان میں برابری کا درجہ ہے مرد بھی اور عورت بھی کئی امور میں مساوات کے حامل ہیں۔ فرمایا۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ عورتیں تمہارے لئے لباس ہیں اور تم عورتوں کے لئے لباس ہو۔ یعنی مرد اور عورت ایک دوسرے کے پردہ دار اور ہمراز ہیں ان میں کئی باتیں مشترک ہیں گھر۔ رشتہ دار۔ اولاد وغیرہ میں عورت برابر کی شریک سہیم ہے۔

خلاصہ :۔ یہ اسلام کی خصوصیت ہے کہ اس نے عورت کو مرد کے مساوی حقوق عطا فرمائے ہیں۔ اب ان حقوق و فرائض کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

باب (۱۴)

شوہر کے فرائض و آداب

جو فرائض اور ذمہ داریاں مردوں کے ذمے ہیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱- ولیمہ :- نکاح کے بعد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تاکید تھی کہ مرد ولیمہ ضرور کرے اس طرح یہ سنت موکدہ اور مرد کے اولین فرائض میں سے ہے حضورؐ خود بھی نکاح کے بعد یہ دعوت کیا کرتے تھے۔ حضرت زینبؓ کے نکاح کے بعد آپ نے ولیمہ کیا تھا اور صحابہ نے اس میں شرکت کی تھی۔

۲- حسن خلق سے پیش آنا - عورتیں فطری طور پہ کم عقل ہوتی ہیں کیونکہ ان کا دائرہ کار اتنا وسیع نہیں ہوتا جتنا مرد کا ہوتا ہے۔ اس لئے قرآن کی رو سے دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر قرار دی گئی ہے اس لئے عورت کی فطری کمزوری کی بناء پر مرد کو عورت سے حسن سلوک اور چشم پوشی کا حکم دیا گیا ہے فرمایا وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ۔ اور عورتوں کے حسن سلوک سے زندگی گذارو۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جو مرد عورت کی بد خلقی پر صبر کرے اسے اللہ حضرت ایوب علیہ السلام کے صبر کے برابر اجر دے گا۔

۳- ہنسی اور خوش خلقی کے ذریعے ان کے دل کو خوش کرنا - رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہرات سے مزاح بھی کیا کرتے تھے روایت میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑھ کر اپنی بیویوں سے خوش باش تھے۔

۴- ہنسی مزاح میں حدِ اعتدال کا لحاظ :- عورتوں سے ہنسی اور مزاح اور

دل لگی ضرور ہونی چاہیئے لیکن اعتدال کے اندر اس حد تک نہیں کہ مرد کے اقتدار اور حاکمیت کو ٹھیس لگے۔ عورت کی ہر بات کو بے کم و کاست مان لینا اور ہر کام میں عورت کی مرضی کو ترجیح دینا انسان کو ذلیل کر دیتا ہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے عورت کا غلام ہلاک ہوا بیوی کی خواہشات کی تکمیل میں سرگرمی دکھانا گویا اس کی محکومی ہے جو فطری نظام کے خلاف ہے، قرآن مجید میں خاوند کے لئے سید یعنی سردار کا لفظ آیا ہے جیسا کہ سورۂ یوسفؑ میں ہے۔ وَاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَى الْبَابِ ط ان دونوں نے عورت کے سردار یعنی خاوند کو دروازے کے پاس پایا۔ اس لئے اپنی سیادت کو برقرار رکھنے کے لئے جنسی مزاح میں اعتدال شرط ہے۔

- **غیرت میں اعتدال:**۔ غیرت ایمان کا جزو ہے اور بے غیرت شخص معاشرے میں ذلیل اور بے عزت ہے۔ نئی روشنی کی نعمتوں میں سب سے بڑی لعنت غیرت اور ایمان کا خاتمہ ہے اور یہ بے غیرتی اس غیر فطری مساوات سے پیدا ہوتی ہے جو نئی روشنی کا طرۂ امتیاز ہے۔ اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لئے ایسی بے غیرتی کے لئے اس میں کوئی جواز نہیں۔ مرد کی غیرت کا تقاضا یہ ہے کہ عورت کی جائز نگرانی کرے اور بے راہ روی اور مشتبہ چال چلن کے امکانات کا سدِ باب کرے۔ لیکن اس غیرت میں بھی اعتدال شرط ہے۔ کسی قسم کی بدظنی یا بے وجہ بدگمانی درست نہیں قرآن پاک کی رو سے تجسس بالٹوہ میں لگے رہنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ حدیث میں آیا ہے غیرت کی ایک صورت وہ ہے جسے خدا پسند کرتا ہے اور ایک صورت کو پسند نہیں کرتا۔ پسندیدہ صورت یہ ہے کہ مرد کو عورت کے کردار کے کسی پہلو میں شک پڑ جائے اور اور ناپسند غیرت یہ ہے کہ شک پڑنے کے بغیر ہی غیرت کا اظہار کیا جائے۔ اسی طرح تکبر کی وہ صورت جو جنگ کے موقعہ پر ظاہر ہو پسندیدہ ہے اور ناپسندیدہ تکبیر یہ ہے کہ حق کے خلاف اور باطل کی تائید میں کیا جائے۔

حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا سے حضورؐ نے دریافت کیا کہ اے بیٹی عورت کے لئے بہترین چیز کونسی ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ کسی غیر مرد کو نہ دیکھے

۔۔۔۔۔اور نہ ہی کوئی غیر مرد کسی عورت کو دیکھے ۔آپ نے اس پر اپنی بیٹی کو سینے سے لگالیا اور فرمایا کہ میری بیٹی نے نہایت اچھا جواب دیا۔

غرض مرد کا فرض ہے کہ اپنی بیوی کے معاملات میں باغیرت ہو لیکن غیرت میں اعتدال کا اصول برقرار رکھے۔

۶ - نفقہ میں اعتدال - عورت کا خرچ اور نفقہ مرد کے ذمے ہے۔

قرآنِ پاک میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ - یعنی مرد کو عورت پر فوقیت اس وجہ سے ہے کہ وہ اپنے کمائے ہوئے مال کو عورت پر خرچ کرتا ہے۔

لیکن نفقہ کی مقدار کا تعین مرد کی حیثیت اور مالی حالت پر مبنی ہے امیر اور صاحب حیثیت کا معیار اور ہے، اور تنگ دست اور غریب کا اپنی مالی حالت کے پیشِ نظر نفقہ متعین ہے، اس لئے مردوں کے لئے ضروری ہے کہ اعتدال برقرار رکھیں نہ تو کنجوسی سے کام لیں اور نہ اسرافؔ سے ۔ خرچ کے متعلق قرآنِ مجید میں مومن کی یہ صفت بیان کی گئی ہے وَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا۔ یعنی خدا کے مومن بندے نہ تو خرچ کرتے وقت فضول خرچی اور اسراف کرتے ہیں اور نہ ہی کنجوسی سے کام لیتے ہیں۔ بلکہ دونوں حالتوں کے درمیان اعتدال کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔

اور بیویوں کے متعلق خرچ کے متعلق قرآنِ مجید میں ارشاد ہے۔

لِیُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ وَمَنْ قُدِرَ عَلَیْهِ رِزْقُهٗ فَلْیُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰهُ اللّٰهُ - اور چاہیئے کہ خرچ کرے استطاعت والا اور وسعت والا۔ یعنی خوش حال اپنی خوش حالی کو ملحوظ رکھ کر فراخ دلی سے اور جس کا رزق یعنی کمائی محدود ہو تو اُسے اپنے وسائل کے اندر خرچ کرنا چاہیئے جتنا کہ اُسے اللہ نے دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ امیر اور صاحبِ استطاعت کنجوسی نہ کرے بلکہ فراخ دلی سے اپنی عورت اور بچوں پر خرچ کرے۔ اور محدود آمدنی والا

زیادہ خرچ کر کے زیر بار نہ ہو بلکہ اپنے وسائل کے اندر خرچ کرے۔

اپنے گھر کے افراد پر خرچ کرنے کی بڑی فضیلت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر ایک دینار تو اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے اور ایک دینار تو غلام آزاد کرانے پر خرچ کرتا ہے اور ایک دینار تو اپنے کنبہ پر خرچ کرتا ہے تو سب سے زیادہ اجر اس آخری دینار پر ملے گا جو تو نے اپنے بال بچوں اور عورت پر کیا۔

۷- عورتوں سے متعلق ضروری مسائل کا علم :- مرد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اسے عورتوں کے ضروری مسائل اور خصوصی معاملات کا علم ہو جن کا تعلق صرف عورتوں سے ہے مثلاً حیض و نفاس کے معاملات اور مسائل شرعیہ وغیرہ اور وہ اپنی بیوی کو بھی ضروری مسائل کی تعلیم دے سکے، تاکہ یہ دونوں میاں بیوی باہم معاشرت میں جائز حدود شرعیہ کو ملحوظ رکھ سکیں اور خدا کی نافرمانی سے بچ سکیں۔ ارشاد خداوندی ہے۔

قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا - یعنی اے ایمان والو اپنی جانوں اور اپنے اہل و عیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ اس کی عملی صورت یہی ہے کہ مرد کو ان امور کی واقفیت ہو جو معاشرتی زندگی میں خدا تعالیٰ کی رضامندی کا باعث ہیں وہ ان پر عمل کرے اور اہل و عیال کو عمل کرنے کا حکم دے اور ان باتوں سے بچے اور عیال کو بچائے جو اللہ کی نافرمانی کا باعث ہیں۔

۸- عدل و انصاف :- اگر بیویاں ایک سے زیادہ ہوں تو وہ صرف اس صورت میں رکھنی جائز ہیں۔

اگر ان میں پورا پورا عدل کیا جائے ورنہ نکاح ثانی سے منع فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً - اور اگر تمہیں اس بات کا خوف ہو کہ تم عورتوں کے درمیان عدل نہیں رکھ سکو گے تو ایک ہی بیوی رکھو۔

عدل و انصاف نان نفقہ اور شب بسری میں ضروری ہے دلی محبت کے معاملہ میں عدل انسان کے بس میں نہیں، لہٰذا اس فطری جذبے کو ملحوظ رکھتے ہوئے

ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ - اور تم ہرگز عدل کو اختیار کرنے کی طاقت نہیں رکھ سکتے اگرچہ تم ایسی خواہش بھی رکھو۔ تو اس صورت میں یہ نہایت ضروری ہے کہ تم ایک ہی بیوی کی طرف کلیتاً نہ جھک جاؤ اور دوسری کو معلق حالت میں چھوڑ دو (نہ آباد کرو اور نہ طلاق دو)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اخراجات اور شب بسری میں پوری طرح عدل فرمایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے اے اللہ یہ میرے اختیار میں ہے میں کر دیا۔ لیکن میلان طبعی اور دل کے جھکاؤ کا معاملہ میرے اختیار میں نہیں۔

۹۔ جھگڑے کی صورت میں فیصلہ :- جھگڑا اگر دونوں طرف سے پیدا ہو یا صرف مرد کی طرف سے پیدا ہو تو اس کے لئے قرآن مجید میں یہ فیصلہ ہے کہ دونوں طرف سے حکم یعنی نمائندے مقرر ہوں اور وہ مل کر نیک نیتی سے جھگڑے کو ختم کرانے کی کوشش کریں تو اللہ تعالیٰ صلح کی توفیق عطا فرمائیں گے ارشاد ہوتا ہے۔

وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِنْ أَهْلِهَا إِنْ يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا۔ اگر دونوں میاں بیوی میں تمہیں باہم مخالفت کا خوف ہو تو ایک منصف مرد کی طرف سے اور ایک منصف عورت کی طرف مقرر کردہ اگر صلح کا ارادہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان میں صلح کا سامان پیدا کر دے گا۔

ایک دفعہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک منصف کو میاں بیوی کے درمیان صلح کی غرض سے بھیجا۔ وہ واپس آ گیا اور صلح نہ کرا سکا۔ حضرت عمرؓ کوڑا لیکر اس کے گرد ہو گئے کہ تیری نیت صلح کی نہیں کیونکہ نیک نیتی سے صلح کرانے والوں کی کوشش اللہ تعالیٰ رائگاں نہیں گنواتے۔ چنانچہ وہ پھر گیا اور اپنی نیت درست کر لی اور صلح کرانے میں کامیاب ہو گیا۔

۱۰- طلاق :- مرد کو طلاق کا حق دیا گیا ہے۔ لیکن ساتھ میں یہ بھی حکم ہے کہ اشد ضرورت کے بغیر طلاق دینا خدا کے نزدیک پسندیدہ نہیں۔ یہ مباح اور حلال تو ہے لیکن ناپسندیدہ ہے کیونکہ اس سے خانہ بربادی اور منافقت کا پہلو نکلتا ہے۔ مرد کو طلاق دیتے ہوئے مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

(۱) طلاق ماہواری کے ایام میں نہ دی جائے۔ بلکہ طہر کے ایام میں دی جائے۔ کیونکہ اس سے عورت کی عدت میں زیادتی ہوتی ہے۔

(۲) صرف ایک طلاق پر اکتفا کیا جائے کیونکہ اگر مقصد علیحدگی ہے تو بھی عدت ختم کرنے سے وہ پورا ہو جاتا ہے۔ اور اگر دورانِ عدت اپنی غلطی کا احساس ہو جائے تو رجوع کیا جا سکتا ہے۔

(۳) حسنِ سلوک سے کچھ دے دلا کر عورت کو اچھے طریقے سے رخصت کیا جائے مہر کا ادا کرنا تو بہرحال ضروری ہے۔ یہاں دینے سے مراد مہر کے علاوہ زندگی گذارنے کے لئے مال کا دینا ہے تاکہ اسے تکلیف میں کمی ہو۔

(۴) عورت کے پوشیدہ راز وغیرہ کسی کو نہ بتائے کیونکہ اس پر خدا کی سخت ناراضگی کی وعید آتی ہے۔

۱۱- مہر :- یہ وہ رقم ہے جو نکاح کے معاوضہ کے طور پر مرد عورت کو ادا کرتا ہے۔ یہ بھی بہت ضروری ہے۔ قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر اس کی وضاحت آئی ہے لیکن مہر کتنا ہو اس کی تعین قرآن و حدیث میں نہیں اس معاملہ کو عورت و مرد کی باہمی رضامندی پر چھوڑ دیا ہے۔ یعنی مرد کی حیثیت اور طاقت کے مطابق اس کو مقرر ہونا چاہئے۔ نکاح کے وقت اس کا تعین لازمی ہے اگر کسی وجہ سے نکاح کے وقت تعین نہ ہو سکا ہو تو بعد میں بھی اسے مقرر کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی ادائیگی مرد کے ذمے فرض ہے اور یہ عورت کے حق میں مرد کے ذمے قرض کی صورت میں ہے جس کی ادائیگی کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ جب تک اسے ادا نہ کیا جائے وہ عورت اس پر حلال نہیں ہے اگر ادا نہ کرے تو ادا کرنے کی نیت ضرور رکھے۔

باب (۱۵)

عورت کے فرائض

عورت کے ذمے جو مرد کے فرائض ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں -

۱- شوہر کی اطاعت :- عورت پر اپنے مرد کی اطاعت بہرحال فرض ہے وہ ہر اس معاملے میں شوہر کی مطیع رہے جن سے خدا کی نافرمانی نہیں ہوتی - اطاعت سے اُسے مرد کی خوشنودی اور رضامندی اور محبّت حاصل ہوتی ہے - حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے -

اگر کوئی عورت مر جائے اس حالت میں اس کا شوہر اس سے راضی ہو تو ایسی عورت جنّت میں داخل ہوگی -

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک آدمی سفر پر گیا اور اپنی بیوی سے کہہ گیا کہ وہ اوپر کی منزل سے نیچے کی منزل میں نہ اُترے - نچلی منزل میں اس عورت کا باپ رہتا تھا وہ بیمار ہوگیا - اس عورت نے حضورؐ کی خدمت میں ایک آدمی کے ذریعے یہ اجازت مانگی کہ کیا وہ اپنے باپ کی تیمارداری کے لئے نیچے کی منزل میں اُتر سکتی ہے جب کہ اس کے خاوند نے اُترنے سے منع کر دیا ہے - آپؐ نے فرمایا کہ وہ اپنے شوہر کی تابعداری کرے اور نیچے کی منزل میں نہ اُترے - چنانچہ اس کا باپ مر گیا اس پر اس نے پھر اجازت مانگی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا کہ وہ اپنے شوہر کی اطاعت کرے چنانچہ اس کے باپ کو دفن کر دیا گیا -

جب کہ وہ اپنے شوہر کے حکم کے مطابق نیچے نہیں اُتری۔ تو حضورؐ نے اُس کے پاس پیغام بھیجا کہ اللہ تعالےٰ نے حالا دند کی اطاعت شعاری کی بدولت اس کے باپ کو بخش دیا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے دوزخ میں جھانکا تو دیکھا کہ اس میں زیادہ تعداد عورتوں کی ہے۔ عورتوں نے پوچھا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کیوں۔

آپ نے فرمایا اس لئے کہ وہ اکثر لعن طعن کرتی رہتی ہیں اور اپنے خاوندوں کی ناشکری کرتی رہتی ہیں۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ میں نے جنت میں جھانکا تو دیکھا کہ اس میں عورتیں کم ہیں۔ میں نے پوچھا عورتیں کہاں ہیں جواب ملا کہ دو سُرخ چیزوں (سونے اور زعفران یعنی خوشبو و زیور) نے ان کو حصول جنت کے ذرائع کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیا۔

ایک اور حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا کے سوا اگر کسی اور کو سجدہ جائز ہوتا تو میں عورتوں کو حکم دیتا کہ شوہروں کے آگے سجدہ کیا کریں۔

ان احادیث کی رو سے خاوند کی اطاعت کی اہمیت بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔

۲- **مال و عزت کی حفاظت** - عورت مرد کی عزت وآبرو ہوتی ہے اور چونکہ وہ خاوند کے گھر کے مال کی امین بھی ہوتی ہے اس لئے ایک مرد کا تمام مال واسباب اسی کے سپرد ہوتا ہے اور اس کی حفاظت بھی عورت ہی کی ذمہ داری ہے۔ اس لئے عورت کا دوسرا بڑا فرض یہ ہے کہ وہ کسی غیر مرد کو اپنے گھر میں داخل نہ ہونے دے اور خود بھی اس کی اجازت کے بغیر گھر سے نہ نکلے۔ نیز خاوند کے مال کی پوری پوری نگرانی اور محافظت کرے اس کی اجازت کے بغیر ایک حبّہ بھی خرچ نہ کرے یہاں تک کہ صدقہ و خیرات میں بھی مرد کی اجازت ضروری ہے۔ اگر ایسا کرے گی تو مرد کو تو ثواب ہوگا لیکن عورت الٹی گنہگار ہوگی۔ ہاں اگر مرد کو بعد میں راضی کر لیا تو اور بات ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۔ پس نیک بیبیاں

وہ ہیں جو فرمان بردار ہوں اور مرد کی غیر حاضری میں ان چیزوں کی حفاظت کرنے والی ہوں جن کی حفاظت اللہ تعالےٰ نے ان کے سپرد کی ہے۔

۳۔ **قناعت** - اس کا مطلب یہ ہے کہ جائز ضرورت کے علاوہ کسی چیز کا مطالبہ نہ کرے جائز ضرورت کو پورا کرنا تو ویسے بھی مرد کا فرض ہے۔ اس سے بڑھ کر مطالبہ بیجا طور پر مرد کو تنگ کرنے والی بات ہے۔ جو سراسر ناجائز ہے۔ اور حکم اطاعت کے خلاف ہے۔ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں اور اب بھی کہیں کہیں یہ دستور تھا کہ اگر مرد سفر پر جاتا تو اس کی بیوی کہتی کہ حرام کی کمائی سے بچنا کیونکہ ہم بھوک اور تکلیف تو برداشت کر لیں گے لیکن عذاب الہٰی برداشت کرنے کی ہم میں طاقت نہیں۔ یعنی مرد کی حلال کی کمائی میں سے ہی وہ خرچ کرنا اپنا حق سمجھتی تھی۔ حرام کی کمائی سے وہ گھبراتی تھیں اور بہت محتاط تھیں کہ مرد حرام کی کمائی کے نزدیک بھی نہ جائیں، لیکن موجودہ "ترقی یافتہ" معاشرہ حالت بالکل برعکس ہے عورت مطالبہ کرتی ہے کہ ہمارا فلاں فلاں مطالبہ پورا کرو خواہ اس میں حلال کی کمائی کا روپیہ خرچ ہو یا حرام کا ہمارا مطالبہ ہر حال میں پورا ہونا ضروری ہے یہ عورتیں زخارف دنیا اور چند روز عیش اور غرور و نمائش کے لئے مردوں کے حق میں شیطان سے کم نہیں ؎

خود تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔ یہ موجودہ پُرفتن دور میں فیشن پر جان دینے والی حوا کی بیٹی کے کردار کی معمولی سی جھلک ہے۔ اور اس سے عورت کا صحیح مقام جو قناعت کی صفت کی پیداوار ہے۔ اور جس کے اختیار کرنے سے اعلیٰ نفس اور بلند حوصلگی کا اظہار ہوتا ہے اور جو نسانیت اور نسوانیت کا جوہر ہے ختم ہو جاتا ہے اور بندہ حرص و آزار لالچ اور ریاکاری اور نمود و نمائش اور غیر مخلصانہ زندگی کا عادی ہو جاتا ہے۔ ایسی عورتوں کی بچیوں میں بھی ماں کی تقلید میں ہر طرح کے نقائص اور ابلیسانہ خواہشات کا ظاہر ہونا لازمی ہے پھر بقول شیخ سعدیؒ

گفت چشم تنگ دُنیا دار را ٭ یا قناعت پر کند یا خاک گور

بے صبر اور قناعت کی صفت سے محروم مرد یا عورت میں اخلاقِ حمیدہ اور خصائل شریفہ

کی پیدائش ختم ہو کر سفلہ کاری اور رذالت کے جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں اور قوم اور معاشرہ کے لیے وبال بن جاتے ہیں۔

خلاصہ:۔ یہ کہ عورت کے فرائض میں شوہر کی تابعداری۔ عزت و مال کی حفاظت اور قناعت تین اہم ترین فرائض کا بیان اہم ہے ان کے علاوہ اور بھی فرائض ہیں لیکن بڑے بڑے یہی تین ہیں۔

باب (۱۶)

حقوقِ اولاد

مناکحت ایک ایسا رشتہ ہے جس کی رو سے دو اجنبی اور غیر خاندان ایک ہی لڑی میں پروئے جاتے ہیں اور جن سے دو فریق (مرد عورت) ایک نہایت مضبوط اور پائیدار اور مستحکم بندھن میں بندھ جاتے ہیں اسی کے نتیجہ میں اولاد پیدا ہوتی ہے کیونکہ ازدواجی تعلقات کا مقصد ہی افزائش نسل انسانی ہے۔ پہلے جو زوجین تھے؟ اب والدین بن جاتے ہیں۔ بچّے کو چونکہ ابھی اپنے حقوق و فرائض کا شعور نہیں ہوتا اس لیے سب سے پہلے اولاد کے حقوق والدین کے ذمّے ثابت ہوتے ہیں۔ جن کا ادا کرنا والدین پر فرض ہوتا ہے۔ اس لئے یہاں حقوق اولاد یا فرائض والدین کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یہاں اس امر کا جائزہ لیا جائے گا کہ طلوع اسلام یا اس عہد میں یعنی ظہور اسلام کے وقت دُنیا کی قومیں اولاد سے کیا سلوک کیا کرتی تھیں، تاکہ اس کے مقابلے میں اسلامی خصوصیات کو سمجھنا آسان ہو جائے۔

اس زمانے میں بعض قومیں اپنی اولاد دیوتاؤں کے نام پر قربان کر دیا کرتی تھیں۔ چنانچہ اولاد کو بتوں اور استھانوں پر بھینٹ چڑھایا جاتا تھا ہندوستان میں کالی دیوی کی بھینٹ کی خاطر ایسی سنگدلی اور سفاکی اور قتل اولاد کے مظاہرے عام تھے اسی طرح مصر میں دریائے نیل میں طغیانی لانے کی خاطر ہر سال ایک کنواری لڑکی کی قربانی ادا کرنے کا رواج تھا، یہ رواج جناب امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ تک قائم رہا اور جب مصر کی فتح مکمّل ہوگئی اور مصر کے مسلمان حاکموں کو اس رواج اور قبیح رسم کا

علم ہوا تو اس کی اطلاع حضرت عمرؓ کی خدمت میں بھیجی گئی۔ آپؓ نے اس رسم کو بند کرا دیا اور دریائے نیل کے نام ایک خط لکھ کر حکم دیا کہ اسے دریائے نیل میں ڈال دیا جائے اور لڑکی کی قربانی بند کر دی جائے۔

اس میں آپؓ نے لکھا تھا کہ اے دریائے نیل تو خدا کے حکم کے تابع ہے اگر تیرا سیل تیری اپنی مرضی پر ہے تو جس طرح چاہے کر، اگر خدا کی مرضی کے ماتحت ہے تو اپنی طغیانی سے یہاں کے باشندوں کے لئے فائدہ مند ثابت ہو۔ مورخین کہتے ہیں کہ اس خط کا دریا میں گرنا تھا کہ دریا میں طغیانی آگئی اور لوگوں نے فصلوں اور کھیتوں کے لئے پانی کا ذخیرہ کر لیا۔

عربوں میں قبل از اسلام اس بات کا رواج تھا کہ افلاس اور تنگدستی سے مجبور ہو کر اپنی حقیقی اولاد کو موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے (دراصل وہ خاندانی منصوبہ بندی کرتے تھے) اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ خدا کی رزاقی اور مالکیت پر شک کرتے تھے اور اپنے آپ کو اولاد کا روزی رساں سمجھتے تھے۔ اور بعض قبیلوں میں رواج تھا کہ لڑکی کی پیدائش کو برداشت نہیں کرتے تھے انہیں یہ جھوٹی غیرت شرم دلاتی تھی کہ کوئی ان کا داماد بھی ہو۔ اس لئے عموماً لڑکی کو زندہ زمین میں دفن کر دیا جاتا تھا۔ قرآن پاک میں ہے وَاِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ۔

اور جب معصوم زمین میں زندہ دفن کر کے ہلاک کی گئی لڑکی سے سوال کیا جائے گا کہ تجھے کس گناہ کی پاداش میں قتل کیا گیا۔ کسی شاعر کا کیا ہی خوب شعر ہے۔

الٰہی کس بے گناہ کو مارا سمجھ کے قاتل نے کشتنی ہے!
کہ آج کوچے میں اس کے شورِ بایِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ہے

اسلام کا آغاز ہوا تو اولاد کا قتل حکماً بند کر دیا گیا۔ فرمایا
قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَھُمْ سَفَھًا بِغَیْرِ عِلْمٍ یقیناً وہ لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں جنہوں نے اپنی اولاد کو بیوقوفی سے لاعلمی کی حالت میں قتل کر دیا۔
جو لوگ اپنی اولاد کو غربت و افلاس کی بنا پر قتل کر دیا کرتے تھے ان سے کہا کہ ہم ایسا

مت کرو تم ان کے رازق نہیں بلکہ ہم تم کو اور ان کو سب کو رزق دینے والے ہیں۔ فرمایا۔
وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ - اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کیا کرو ہم ان کو بھی روزی دیتے ہیں اور تم کو بھی۔

جن لوگوں کو زمانہ جاہلیت میں غیرت خاندانی اس بات پر ابھارتی تھی کہ وہ اپنی معصوم بچیوں کو منحوس سمجھ کر زندہ درگور کر دیتے تھے پھر طرح طرح کے حیلے بہانے تلاش کرتے تھے ان کے متعلق قرآن شریف میں یہ الفاظ ہیں۔ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ - اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ۔
اور جب خوشخبری دی جاتی ہے کسی کو ان میں سے لڑکی کی پیدائش کی تو اس کا چہرہ غصے سے سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ غصے سے دانت پیس رہا ہوتا ہے۔ اس بری خبر کی بدولت وہ چھپتا پھرتا ہے کہ آیا اس بے عزتی کی چیز کو باقی رکھے یا اسے زمین میں زندہ دفن کر دے۔ قرآن پاک میں زندہ درگور کی ہوئی لڑکیوں کا قصہ نہایت دردناک پیرایہ میں بیان کر کے ان لوگوں کی سفاکی کی نشاندہی کی گئی ہے اور لوگوں کی ہمدردی اور ترحم کے جذبہ کو اُبھارا گیا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کی ہوئی آیت میں مذکور ہے۔
(وَاِذَا الْمَوْءُدَةُ) اس طرح آفتاب اسلام نے طلوع ہو کر جہالت سفاکی اور حمیۃ الجاھلیۃ کا خاتمہ کر دیا اور لوگوں کو از سر نو انسان بنایا۔ عرب کی کایا پلٹ گئی وہی کندہ تراش بات بات پر لڑ جانے والے اور نیم وحشی بدو مہذب ترین قوم بن گئے۔ حتیٰ کہ دُنیا نے انہیں سے تہذیب و تمدن ثقافت صفائی نفاست اور علوم فنون سیکھے۔

اولاد کے ساتھ بدسلوکی کو اسلام نے ختم کر کے فطری محبت اور اولاد کے فرائض سے آگاہ کیا، ذیل میں ان حقوق کا جو اولاد کے سلسلہ میں والدین کے ذمہ ہیں اندراج کیا جاتا ہے۔
پرورش:۔ سب سے پہلا حق پرورش کا ہے۔ کیونکہ بچہ ماں باپ کے رحم و کرم پر

ہی ہوتا ہے پہلا مسئلہ رضاعت یا دودھ پلانے کا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔
وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ
اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ اور مائیں اپنے بچوں کو کامل دو سال دودھ پلائیں یہ اس
شخص یا فریق کے لئے ضروری ہے جو رضاعت کی مدت کو پورا کرنا چاہتا ہے۔ فقہ
حنفی میں مدت رضاعت اڑھائی سال ہے لیکن کم سے کم مدت دو سال ضروری ہے۔
اس سے کم مدت دودھ نہیں پلانا چاہیئے۔

لڑکی کی پیدائش کو چونکہ بہت پہلے وقتوں میں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا
اس لئے حضورؐ نے خصوصی طور پر اس لئے فرمایا کہ لڑکی کی پرورش والدین اور دوزخ
کے درمیانی پردہ ہے۔ اور فرمایا کہ جس نے دو لڑکیوں کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ
جوان ہوگئیں پھر نکاح کر کے انہیں رخصت کر دیا تو ایسا شخص جنت میں اس طرح
جس طرح ہاتھ کی انگلیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں میرے ساتھ ہوگا۔

پھر مطلقہ عورتوں کو اختیار دیا گیا ہے وہ دودھ پلائیں یا نہ پلائیں اگر دودھ
پلائیں تو بچے کے باپ یا وارث کے ذمے اس بچے اور ماں کا تمام خرچ برداشت کرنا ہوگا۔
پھر اور فرائض میں سے عقیقہ کرنا یعنی ساتویں دن لڑکے کی صورت میں دو بکرے
اور لڑکی کی صورت میں ایک بکرا ذبح کرنا ضروری ہے۔ کہ یہ بچے کا حق ہے۔ پھر اسلامی
نام رکھنا یہ بھی ساتویں دن ضروری ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ خدا
کے نزدیک محبوب نام وہ ہیں جو عبد سے شروع ہوتے ہیں۔ مثلاً عبداللہ یا عبدالرحمٰن
وغیرہ اور ساتویں دن سر کے بال منڈوا کر ان کے وزن کے برابر چاندی کو خدا کے راستہ
میں دینا ضروری ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی تمام اولاد سے محبت تھی لیکن حضرت
فاطمہ رضی اللہ عنہا سے بہت ہی محبت تھی۔ آپ جب کبھی حضور کی خدمت میں آتیں تو
آپ اٹھ کر استقبال فرماتے اور ان کے بچوں یعنی امام حسنؑ اور امام حسین علیہ السلام
کے ساتھ بھی آپ انتہا سے زیادہ محبت اور شفقت کرتے تھے انہیں گود میں اٹھا کر

کھلاتے، انہیں کندھوں پر اٹھاتے حتیٰ کہ جب وہ حضورؐ کے سجدہ کرتے وقت آپ پر سوار ہو جاتے تو انہیں کچھ نہ کہتے اور سجدے سے صرف اس وقت اٹھتے جب وہ خود بخود اتر جاتے۔

۲۔ تعلیم و تربیت۔ دوسرا بڑا فرض والدین کے ذمے بچوں کی بہترین تعلیم و تربیت ہے۔ اگر اولاد کو صحیح اسلامی تربیت اور تعلیم دی جائے اور اسلامی ماحول کا رنگ چڑھایا جائے تو ایسا بچہ بڑا ہو کر تمام کام اللہ اور رسولؐ کی رضامندی کے پیش نظر کرے گا۔ اور کسی امر میں اس کے خلاف نہ کرے گا اور آخرت میں نجات حاصل کرے گا۔ اور اگر آج کل کے زمانے کی طرح غلط اور غیر فطری ماحو میں اور غیر اسلامی اصولوں پر اپنی اولاد کی تربیت کرے گا اور انہیں وہ تعلیم دیگا جس میں نہ والدین کے ساتھ اچھے برتاؤ کا سبق ملتا ہے نہ ہی گردوپیش کے ماحول سے حسن خلق یا احسان و ترحم کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے اسباق ملتے ہیں۔ نہ ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم کون ہیں ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے۔ ہم کو دنیا میں کس کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیے یعنی تعلیم و تربیت اسلامی سے انحراف کر کے موجودہ دور کے جاری کردہ نظام تعلیم اور بے دین طرز کے بودوباش میں امداد دینے والے اپنی روایات اور خودی کے منافی ماحول تربیت میں ان کو بے لگام چھوڑ دیا جائیگا تو بچہ بڑا ہوا حیوان کا حیوان رہے گا۔ وہ اپنے والدین سے نیک سلوک کرنا تو کجا انہیں خاطر ہی میں نہ لاتے گا اور اگر خدانخواستہ پی سی ایس یا سی ایس پی بن جائے گا یعنی سول سروس جیسی غلامی کی باقی ماندہ نشانیوں اور لعنتی دفتری نظام سے منسلک ہو جائے گا یعنی ذمہ دار انتظامی معاملے پر متعین ہو جائے گا اور والد یا والدہ کسی ضروری کام کے لئے اس کے پاس آئیں گے تو انہیں پاس پھٹکنے بھی نہ دے گا۔ وہ انسان کے جامہ میں حیوان بن جائے گا اور خسر الدنیا و الآخرہ کا زندہ نمونہ ہوگا۔

ایسی ہی تربیت اور تعلیم حاصل کرنے والا انسان جب خدا کے سامنے قیامت میں

پیش ہو گا تو آپؐ کی حدیث کے مطابق تمام ذمہ داری اپنے والدین پر ڈال دے گا اور خدا سے عرض کرے گا کہ یا اللہ میرے والدین کو جنہوں نے ایسی غلط اور فضول تعلیم و تربیت دیکر مجھے آخرت میں ذلیل کیا بڑے عذاب میں مبتلا کر۔

اسلامی اور فطری ماحول میں بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت سے والدین کیلئے ایک طرح کا صدقہ جاریہ بن جاتا ہے۔ حدیث میں ہے۔ اگر کوئی نیک اولاد چھوڑ آئے جو والدین کے لئے دعا کرتی رہے تو یہ صدقہ جاریہ ہے۔

۳۔ عدل و مساوات :۔ تمام اولاد کے مابین خواہ لڑکا ہو یا لڑکی اور خواہ چھوٹا ہو خواہ بڑا مساوات کا برتاؤ کرنا ضروری ہے۔ کئی گھرانوں میں رواج ہے کہ لڑکے کی پیدائش پر ناچ گانے اور خوشیوں اور کھیل تماشے اور فضول قسم کی رسمیں کی جاتی ہیں لیکن بچی کی پیدائش کے وقت نہ کوئی رسم مناتے ہیں اور نہ کسی خوشی کا اظہار ہوتا ہے۔ اسلام کی رو سے یہ ناجائز ہے۔ اسلام نے اولاد ذکور و اناث میں انصاف مساوات اور عدل کرتے ہوئے لڑکیوں کو بھی والدین کا وارث بنایا ہے۔ ارشاد ہے۔ يُوْصِيكُمُ اللّٰهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ۔ اللہ تعالٰی تمہیں وصیت کرتا ہے یعنی حکم دیتا ہے کہ ہر مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔

بظاہر یہ حکم مساوات کے خلاف ہے لیکن اگر حقیقت حال کو بغور دیکھا جائے تو کمائی کرنا صرف مرد کا کام ہے عورت کی ذمہ داریاں اس معاملہ میں کم ہیں گویا لڑکی شادی ہونے کے بعد مرد کی کمائی سے بھی حصہ لیتی ہے خود نہیں کماتی بلکہ اس کے اخراجات خاوند کے ذمے ہیں۔

علاوہ ازیں یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جانی چاہیئے کہ اسلام کے آغاز کے وقت لڑکیوں اور عورتوں کو معاشرہ میں کس قدر ذلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا لیکن یہ خدا کا احسان خاص طور پر عورت پر ہے کہ معاشرے میں اس کو اسلام کی وجہ سے اس کا جائز مقام مل گیا۔

بعض قوموں میں رواج ہے کہ والد کی جائیداد کا وارث صرف اس کا بڑا بیٹا ہوتا ہے۔
چھوٹے بیٹے اس حق سے محروم ہوتے ہیں۔ اور لڑکیوں کو مطلقاً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔
ان کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں کہ اسے معاشرے میں سر اٹھا سکیں۔
چنانچہ والدین پر یہ نہایت ضروری ہے کہ ہر بچے کو ایک نگاہ سے دیکھیں اور
کسی کو کسی پر ترجیح نہ دیں۔

۴۔ آزادی رائے ۔ جب اولاد جوان ہو جائے تو شادی بیاہ کے معاملے میں
اُن کی رائے کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جب لڑکے یا لڑکی نے تمام عمر اُسی کے
ساتھ گذارنی ہے جو اس کی ہونے والی بیوی یا شوہر ہے تو ان کی رائے کو
پس پشت نہیں ڈالا جا سکتا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک
آدمی نے اپنی لڑکی کا نکاح ایک ایسے شخص سے کر دیا جو اس کی مرضی کے بالکل
خلاف تھا وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور بتایا کہ میرا شوہر
مجھے بالکل پسند نہیں۔ یہ نکاح زبردستی میرے والد نے کرا دیا ہے اور میری مرضی
کے خلاف ہے۔ حضورؐ نے اسے اختیار دے دیا کہ چاہے وہ اس مرد کے ساتھ
رہے چاہے الگ ہو جائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں اولاد کی رائے کی
ضرورت ہو ضرور ان کی رائے معلوم کرنی چاہیے۔

لیکن یہاں بھی اعتدال کا راستہ ہی اختیار کیا جائے بعض لڑکیاں خود سری
اور ضد کی بنا پر والدین کی مرضی کے مطابق رشتوں سے انکار کر دیتی ہیں اسی طرح
بعض لڑکے بھی ایسا کرتے ہیں یہ صورت بہت تکلیف دہ ہے عموماً نوجوانی کی
حالت میں لڑکی یا لڑکا اندھا ہو جاتا ہے اور وہ اقدام بعض اوقات کر لیتا ہے جس
سے وقتی طور پر تو اس کی تسکین ہو جاتی لیکن اس کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔
نئی تہذیب کا ایک ثمرہ یہ بھی ہے۔ اور ریڈیو ٹیلی ویژن اور اخبارات کے فلمی کالم
اس معاملے میں نئی پود کے لئے مکمل رہنمائی کرتے ہیں۔ موجودہ دور میں لڑکے اور
لڑکیاں شیطانی گمراہی اور بے راہ روی کی حالت میں اپنے جذبات سے کام لیتے ہیں۔

اور بزرگوں اور خیراندیشوں کی باتوں سے انہیں نفرت ہے وہ صرف فلمی ماحول کو اپنی زندگی کا معیار قرار دیکر اسی سے اپنی آئندہ زندگی میں راہ نمائی کے طالب ہوتے ہیں۔ اور اسی وقتی جذبے کے زیر اثر ایسے اقدام کرنے سے بھی نہیں چوکتے جو ان کی زندگی اجیرن بناتا ہے اور ان کا مستقبل تباہ کر دیتا ہے۔ اسی لئے خودکشیاں اور حرام موت کی وارداتیں عام سنی جاتی ہیں ابھی چند روز ہوئے اسی قسم کے ایک جوڑے نے لاہور میں خودکشی کا ارتکاب کیا تھا اور پیچھے دو سوگوار خاندان چھوڑ گیا تھا وہ بھی مادی ماحول میں اپنے لئے تسکین کا سامان ڈھونڈتے تھے گویا جلتے ہوئے تنور سے برف کی ٹھنڈک کے طلب گار تھے یا زہر سے شفا حاصل کرنا چاہتے تھے یہ دونوں نوجوان تھے ایک ان میں سے لڑکی تھی اور دوسرا لڑکا تھا دونوں امیر خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے انہیں دنیا کا ہر عیش و آرام میسر تھا لیکن ان کا تمام کا تمام ماحول غیر فطری اور خلاف اسلام اور مادی تھا اس لئے خدا کے عذاب سے نہ بچ سکے۔

اس لئے آزادی رائے اگرچہ لڑکے یا لڑکی کا حق ہے لیکن اس حق کو استعمال کرتے ہوئے کئی پہلوؤں پر غور ضروری ہے اور غیر مشروط اور بے قاعدہ اور بے اصول آزادی رائے نہایت برے نتائج پیدا کرتی ہے۔

باب (۱۷)

حقوق الوالدین

جب والدین اولاد کے حقوق ادا کرنے کے بعد اپنے فرائض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں اولاد جوان ہو جاتی ہے اور والدین کی عمر بڑھاپے کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے تو اولاد پر والدین کی خدمت اور والدین کے احسانات کو لوٹانے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور ان پر والدین کی ہر جائز ضرورت کو پورا کرنے کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔

والدین اور اولاد کا خاص رشتہ ہے جو دنیا میں کسی اور کا نہیں یہ نزدیک ترین اور مقدس ترین رشتہ ہے۔ والدین جس طرح اولاد کی خاطر ہر طرح کی تکلیف کو راحت سمجھ کر برداشت کرتے ہیں اور کوئی بھی نہیں کرتا اور ان کی یہ محبت اور مشقت پرخلوص اور بے غرض ہوتی ہے۔ وہ اس خدمت کا معاوضہ نہیں چاہتے انسان تو انسان جانوروں میں بھی یہ رشتہ موجود ہے ماں بچے کو دیکھے بغیر بے تاب ہو جاتی ہے گائے یا بھینس اس وقت تک دودھ نہیں دیتی جب تک اس کے بچے کو پہلے دودھ نہیں پلایا جاتا۔

والدین کے ان احسانات کا بدلہ اولاد سے ممکن ہی نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اولاد ماں باپ کے حق ادا کرنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے اور ان کے احسانات کا بدلہ دے ہی نہیں سکتے۔ ہاں اس صورت میں ان کی حق آدائی ہو سکتی ہے کہ ماں باپ غلام ہیں اور لڑکا ان کو آزاد کرا دے۔

حمل کی صورت میں ماں کی مشقت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا اور رضاعت کے دو سال

بھی ایسے ہیں کہ ماں سرتاپا مشقت بن کر بچے کو اپنا خون دودھ کی شکل میں پلاتی ہے۔ پھر والد بچے کے لئے خون پسینہ ایک کرکے محنت و مشقت کرتا ہے تاکہ بچہ آرام سے اس کی کمائی کھائے اور آسائش سے رہے، وہ اپنی تکلیفوں سے بڑھ کر بچے کی ایک معمولی تکلیف کا خیال رکھتے ہیں۔ اور حتی الامکان بچے کو تکلیف نہیں ہونے دیتے جب بچہ سردیوں کی راتوں میں بستر پر پیشاب کر دیتا ہے تو ماں خود گیلی جگہ پر سوتی ہے لیکن بچے کو آرام دینے کے لئے خشک جگہ پر سلاتی ہے۔

۱۔ **والدین کا مقام** ۔ سب سے مقدم یہ امر ہے کہ بچہ والدین کی حیثیت اور مقام کو سمجھے خداوند کریم نے اپنے حقوق کے ساتھ والدین پر احسان کرنے کا حکم دیا ہے اسی لئے والدین کے مقام کو سمجھا جا سکتا ہے، اور ان کی پدری اور مادری حیثیت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَقَضٰی رَبُّکَ اَنْ لَا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا۔ اور تمہارے پروردگار نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ احسان کرو۔ یعنی بہترین سلوک روا رکھو۔ ایک اور مقام پر جہاں اپنے شکر کا حکم دیا ہے ساتھ ہی والدین کے شکریہ کا حکم بھی دیا ہے۔

اَنِ اشْکُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْکَ ۔ کہ تو میرا شکر ادا کر اور والدین کا شکر بھی ادا کر۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بِرُّ الْوَالِدَیْنِ اَفْضَلُ مِنَ الصَّلٰوۃِ وَالصَّدَقَۃِ وَالصَّوْمِ وَالْحَجِّ وَالْعُمْرَۃِ وَالْجِہَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ

یعنی والدین سے حسن سلوک نماز روزہ صدقہ حج عمرہ اور خدا کے راستہ میں جہاد سے بھی افضل ہے۔ یہ تمام امور ارکان اسلام میں سے ہیں جن پر والدین سے حسن سلوک کو فوقیت اور ترجیح دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ارکان اسلام تمام باقی امور پر فضیلت رکھتے ہیں اسی سے والدین کے ساتھ احسان اور حسن سلوک کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۲۔ **محبت اور احترام** :۔ جس قسم کا ادب احترام والدین کا اولاد کے لئے ضروری ہے وہ محتاج بیان نہیں گذشتہ پیرا میں ان کے مقام کو سمجھتے ہی ان کے ادب و احترام کا طریقہ بھی سمجھ میں آسکتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔

اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَا اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا۔ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا۔

اگر تیرے سامنے والدین میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں تو تو انہیں اُف تک نہ کہہ اور انہیں مت جھڑک اور ان کے ساتھ مہربانی کی بات کر (ادب سے کلام کر) اور ان کے ساتھ بڑی مہربانی سے اپنے آپ کو جُھکا دے اور ان دونوں کے لئے اللہ سے دعا مانگ کہ اے پروردگار تو ان دونوں پر اس طرح رحم کر جس طرح مجھ پر بچپن کی حالت میں انہوں نے رحم کیا۔

اپنے والدین کا احترام تو لازمی ہے ہی مگر اسلام میں ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے کا حکم ہے کہ دوسرے لوگوں کے والدین کا احترام بھی کرے اور ایسا طرزِ عمل اختیار کیا جائے کہ دوسرے بھی اس کے والدین کی عزت اور احترام کریں۔ حدیث کے الفاظ ہیں کہ جو بڑوں کی عزت نہیں کرتا اور چھوٹوں پر شفقت نہیں کرتا وہ مسلمان نہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے فرمایا کہ والدین کو گالی دینا کبیرہ گناہ ہے۔ صحابہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کوئی اپنے والدین کو بھی گالی دیتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں وہ اس طرح کہ کوئی دوسرے شخص سے لڑ کر اس کے والدین کو گالی دیتا ہے تو وہ جواب میں اس کے والدین کو گالی دیتا ہے اس طرح وہ گویا اپنے والدین کو گالی دینے کا باعث بنتا ہے۔ اس طرح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ذرائع پر بھی پابندی لگا دی جو کسی طرح احترام والدین کے منافی ہوں۔

جہاں تک والدین سے محبت کا تعلق ہے یہ ایک فطری امر ہے اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اپنے والدین پر محبت کی ایک نظر ڈالتا ہے اسے ایک حج کا ثواب ملتا ہے۔

۳۔ **خدمت و اطاعت**۔ احترام و محبت کے تقاضے کے طور پر اس سے نتیجتاً اطاعت و خدمت کے جذبات کا آغاز ہوتا ہے والدین کی اطاعت ہر حالت میں

فرض ہے سوائے اس صورت کے کہ اگر والدین بے دین ہوں اور شرک کی طرف دعوت دیں تو اس صورت میں ان کا حکم نہ مانا جائے لیکن اس صورت میں بھی ان کا احترام ہر حال میں مدِ نظر رکھا جائے۔ اور دُنیا کے تمام امور میں ان کی اطاعت اختیار کی جائے اور ایسی صورت اختیار کرنی چاہیئے کہ اُنہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو نہ ہی ان کی خدمت میں کمی کرنی چاہیئے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِىْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِى الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا۔ اور اگر وہ کوشش کریں کہ تو میرے ساتھ ان چیزوں کو شریک ٹھیرائے جن کا تجھے علم نہیں تو ان کی اطاعت نہ کر اور دنیاوی معاملات میں دستور کے مطابق ان کا ساتھ دے۔

حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید کرتے ہوئے فرمایا کہ صبح و شام والدین کی اطاعت میں بسر کرو اگرچہ وہ ظلم بھی کریں ان کی اطاعت سے جنت کے دروازے اس پر کھل جائیں گے اور نافرمانی پر جہنم کے دروازے کھل جائیں گے اگرچہ وہ یعنی والدین ظلم بھی کریں۔

والدین کی فرماں برداری کا یہاں تک حکم ہے کہ اگر کسی شخص کی بیوی کو اس کے والدین پسند نہ کریں اور اسے حکم دیں کہ وہ اسے علیحدہ کر دے تو اس شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے اور والدین کو کسی صورت میں ناراض نہ کرے۔

افسوس کہ موجودہ تعلیم و تربیت میں ایک مسلمان کے لئے ایسے اسباق کہیں نظر نہیں آتے اور اس قسم کی اسلامی تربیت اور تہذیب سے ہمارا معاشرہ کورا ہے یہی وجہ ہے کہ والدین کو آج کل کی اولاد کوئی حیثیت دینے کو تیار نہیں بزرگوں اور والدین کا ادب تعظیم اور فرماں برداری فراموش شدہ داستانیں ہیں جو نئی روشنی اور جدید تعلیم میں ایک اچنبھا اور نرالی چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔ حالانکہ یہی آداب و قواعد اور تہذیب اسلامی کے وہ زریں باب تھے جو پہلے زمانے کے اہل اسلام میں ان کے گھروں اور مجلسوں میں اور ان کے معاشرے کے درخشاں باب تھے۔ ان اصولوں پر عمل کر کے قدیم

مسلمان سر بلند تھے اور ان ہی کو چھوڑ کر آج کل کا معاشرہ شتر بے مہار معاشرہ بن گیا ہے اس کو یہ تک معلوم نہیں کہ ہم مسلمانوں کا ایک درخشاں اور روشن اور قابل تقلید اصول تھا جو اگرچہ کتابی صورت میں تو کم تھا لیکن روایتی طور پر ہر جگہ جاری و ساری تھا اور انہیں اصولوں پر عمل پیرا ہو کر ہم مسلمان تمام دنیا کے رہنما تھے اور آج ان کو ترک کر کے ہم اپنی رہنمائی کے لئے اغیار بلکہ دشمنانِ اسلام اور مادی تہذیب کے علم برداروں کے رہین منت ہیں۔

۴- احسان - اس مفہوم پر پہلے ایک مستقل عنوان کے تحت بیان ہو چکا ہے۔ قرآنِ پاک میں ہے۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا والدین سے احسان کرو۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے۔ وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ ۔ اور ہم نے انسان کو حکم دیا اپنے والدین سے احسان کرنے کا۔ اس کی ماں اس کو پیٹ میں اٹھاتی ہے اور تکلیف پر تکلیف (یعنی کمزوری پر کمزوری) برداشت کرتی ہے ۔ اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس مہینوں سے کم نہیں ہوتی۔ یہ بھی حکم دیا کہ میرا اور اپنے والدین کا مشکور رہو۔

ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ میں کس کے ساتھ نیک سلوک کروں آپ نے فرمایا۔ اپنی ماں کے ساتھ۔ اس نے پھر عرض کی اس کے بعد پھر وہی جواب دیا۔ پھر عرض کی تو تیسری دفعہ بھی آپ نے فرمایا اپنی ماں کے ساتھ۔ چوتھی بار اس نے پھر وہی سوال کیا تو اس مرتبہ آپ نے فرمایا اپنے باپ کے ساتھ اور پھر جو اس سے زیادہ قریب ہو اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ والدہ سے حسنِ سلوک کی کس قدر تاکید اور اس کی کس قدر اہمیت ہے۔

والدین سے نہ صرف مسلمان ہونے کی صورت میں بلکہ اگر مسلمان نہ بھی ہوں پھر بھی حسنِ سلوک کا حکم ہے۔ حضرت اسماءؓ بنت ابی بکرؓ فرماتی ہیں کہ میری ماں میرے

پاس آئی اور وہ مشرکہ تھی یہ قریش سے صلح کا زمانہ تھا میں نے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری ماں میرے پاس آئی ہے اور اسے اسلام سے کوئی رغبت نہیں کیا میں اس سے نیک سلوک کروں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں اس سے نیک سلوک کر۔

۵۔ والدین رشتہ داری کی بنیاد ہیں۔ ننھیال اور ددھیال دونوں طرف کے رشتہ دار والد اور والدہ کے وجود سے قائم ہیں۔ اسلام نے جہاں والدین سے نیک اور بہترین سلوک کی ہدایت کی ہے وہاں اقارب اور اعزہ سے بھی حسن سلوک پر زور دیا ہے۔ اور اسی کا نام اسلامی اصطلاح میں صلہ رحمی ہے۔ اس کے مقابلہ میں لفظ قطع رحمی ہے جس کے معنی رشتہ داروں سے تعلقات منقطع کرنے کے ہیں۔ اور یہ خدا تعالےٰ کے احکام کی نافرمانی ہے۔ اور صلہ رحمی یا رشتہ داروں اور رشتہ داریوں کو جوڑنا یا ملاپ کرانا۔ خدا تعالےٰ کی خوشنودی اور رضامندی کا باعث ہے اور اسی سے والدین کی روح کو ثواب پہنچتا ہے اگر وہ خدا کو پیارے ہو چکے ہوں۔

ایک شخص رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک بڑے گناہ میں مبتلا ہو گیا ہوں کیا میرے لئے توبہ کا کوئی راستہ ہے حضورؐ نے فرمایا تیری ماں زندہ ہے عرض کیا نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ خالہ ہے اس نے جواب دیا' ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپؐ نے فرمایا جا اس کے ساتھ نیکی کر۔

حضورؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ بہترین نیکی والدین کے تعلقات کو زندہ رکھنا ہے یعنی والد کے دوستوں اور عزیزوں کا احترام کیا جائے۔ اسی طرح والدہ کی رشتہ دار عورتوں یا مردوں یا والدہ کی سہیلیوں کی عزت و احترام بجا لانا بھی ثواب کا کام ہے۔ اور ان سے وہی سلوک کیا جائے جو ماں کی زندگی میں اس کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

۶۔ دعائے مغفرت ۔ والدین سے حسن سلوک کا سلسلہ مادی زندگی تک ہی نہیں بلکہ مرنے کے بعد تک بھی جاری رہتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ابن آدمؑ کے اعمال کا

کا سلسلہ موت کے بعد ساتھ منقطع ہو جاتا ہے۔

سوائے چند صورتوں کے جن میں ایک صورت باقیات الصالحات یعنی نیک اولاد کا پیچھے چھوڑ جانا بھی ہے۔ جب والدین کے حق میں دعائے خیر کریں گے تو اس کا ثواب مرنے والے کی روح کو ضرور ملے گا۔ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا کہ کیا والدین کی موت کے بعد بھی ان کا کوئی حق رہ جاتا ہے۔ فرمایا ہاں اُن کے لئے نماز پڑھ استغفار کر یعنی گناہوں کی مغفرت کی دُعا مانگ ان کے وعدوں اور وصیتوں کو پورا کر اُن کے قرابتداروں سے حسن سلوک کر اور اُن کے دوستوں کی تعظیم و تکریم کر۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات واضح کرتے ہیں۔ کہ یہ تمام امور ایسے ہیں جو والدین کے فوت ہو جانے کے بعد اُن کے حقوق کی ادائیگی کی صورتیں ہیں جن میں سے مقدم دعائے و استغفار ہے۔

والدین کے مغفرت کی دعا ہر حال میں اور ہر موقعہ پر کرتے رہنا چاہیئے۔

یہ دعا بڑی جامع اور مختصر ہے۔

رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ - اے میرے پروردگار مجھے بھی بخش دے میرے گناہ بھی معاف فرما دے اور اسی طرح میرے والدین کے گناہ معاف کر کے ان کو بھی بخشش کے انعام سے نواز (آمین)

اہم سوالات

۱۔ عائلی اور متاہل زندگی پر تبصرہ کریں، اور نکاح کے فوائد اور مصلحتیں مختصر طور پر بیان کریں۔

۲۔ اسلام نے خاوند اور بیوی کے جو حقوق اور فرائض مقرر کئے ہیں ان کی تفصیل اس طرح واضح کریں کہ کوئی پہلو مبہم نہ رہ جائے۔

۳۔ اسلام سے پہلے اولاد کے ساتھ کس طرح سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ مختلف ملکوں اور قوموں میں دختر کشی اور قتل اولاد کا جو رواج تھا اسے واضح کریں۔ اور بتائیں کہ اسلام نے اس میں کیا تبدیلی کی اور اس طرز عمل سے دوسری قوموں کے کردار میں کیا تبدیلیاں ہوئیں اور عرب قوموں پر ان کی اصلاح کے بعد کیا اثرات ہوئے۔ واضح کریں۔

۴۔ والدین کے حقوق پر ایک ہمہ گیر اور واضح مقالہ تحریر کریں۔

اسلامی نظامِ تعلیم

مسجد و مکتب

باب (۱۸)

اسلامی نظام تعلیم

علم کا حصول اسلام میں واجب ہے جو آدمی بنیادی اور اصولی مسائل سے بھی واقف نہیں وہ مسلم معاشرہ میں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا اور اگر اس سے لاعلمی میں کوئی خطا سرزد ہو جائے تو اسے شرمندہ ہونا پڑتا ہے اور اس کی لاعلمی عذر شمار نہیں کی جاتی بلکہ اس عذر کے لئے' عذرِ گناہ بدتر از گناہ کا ہدف بننا پڑتا ہے۔

اسلام نے علم کے حصول پر لفظی تاکید یا اسے ایک فضیلت قرار دینے کو کافی نہیں سمجھا بلکہ ایک عملی نظامِ تعلیم وضع کیا ہے یہ نظام قرآنِ کریم کے نزول کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا قرآنِ حکیم ابتدا ہی سے کتاب کی صورت میں لکھا اور پڑھا گیا۔ اس کے نزول کے ساتھ ہی حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اس کی کتابت کا اہتمام فرمایا کرتے تھے۔

اسلام سے قبل عربوں نے کتاب کی شکل میں کوئی لکھی ہوئی چیز شاذونادر ہی دیکھی تھی۔ لیکن قرآنِ حکیم نے نزول نے ہر مسلمان کو خواندگی سکھا دی۔ کتاب اللہ کی تلاوت کی اس قدر فضیلت ہے کہ یہ ملتِ اسلامیہ کا شعار یعنی امتیازی علامت قرار پائی۔ آج تک دیہات میں بھی یہ حال ہے کہ جو بالغ مرد یا عورت قرآن نہ پڑھ سکے اسے بدقسمت اور حرماں نصیب سمجھا جاتا ہے۔

ایک وقت تھا کہ مکہ مکرمہ میں شہر بھر میں کل سترہ (۱۷) آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ مرد تو مرد عورتوں نے بھی قرآن پڑھنا اور لکھنا شروع کر دیا۔ اور تو اور غلاموں نے بھی اس میدان میں سرگرمی دکھائی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم جب

سفر ہجرت پر روانہ ہوئے تو ایک کافر سراقہ بن جعشم نامی نے آپ کا تعاقب کیا لیکن پھر نادم ہوا کیونکہ شاہسوار نبوت کے معجزوں نے اسے اچھی طرح زیر کر لیا تھا اسی کے گھوڑے کے قدم حضورؐ کی طرف اٹھتے ہی نہ تھے چنانچہ ندامت کے عالم میں اس نے حضورؐ سے معافی مانگی رحمت اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے معاف کر دیا لیکن وہ بضد ہوا اور اپنی معافی کو تحریری شکل میں طلب کیا۔ اس پر آپ نے عامرؓ بن فہیرہ ایک غلام صحابی کو حکم دیا کہ اسے امان نامہ لکھ دیا جائے۔

معلوم ہوا کہ اس سفر میں بھی قلم دوات کا سامان ساتھ تھا۔ کیوں نہ ہو۔ جب کہ قرآن حکیم کی پہلی وحی میں ہی قلم کی تعریف کی گئی ہے۔

بدر کی جنگ میں قریش کے بعض اشخاص اسیر ہوئے ان میں سے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے اُن سے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھادو تو آزاد ہو۔ یعنی زرِ فدیہ کی ادائیگی علم پر قربان کر دی گئی۔ حضور نے مسجد نبوی میں ایک مکتب قائم کیا جسے صفہ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ مدینہ منورہ میں کئی مساجد تھیں جن میں بچوں کو تعلیم دی جاتی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں شاذ ہی کوئی بچہ ایسا رہ گیا ہوگا جو پڑھا نہ ہو۔ اس وقت جب تعلیم اتنی عام نہ تھی یہ کارنامہ ان وقتوں کا ہے اور اس کی نظیر دُنیا میں نہیں مِل سکتی۔

تعلیم میں بنیادی چیز قرآن حکیم ہے اور ایک مسلمان کی تعلیم کی ابتدا اسی سے ہوتی ہے۔ اور یہ منصوبہ اس قسم کا تھا کہ اگر کروڑوں روپے بھی خرچ کر دو تو ایسی پاکیزہ اور پاکبازانہ تعلیم حاصل نہیں ہو سکتی۔

میں نے ذکر کیا ہے کہ حضورؐ کے زمانہ مبارکہ میں صحابہ کے علاوہ بعض صحابیات بھی زیورِ علم سے آراستہ تھیں اُنہوں نے قرآن کریم کے علاوہ احادیث کی بھی نقل کی۔ اور علمی سرمایہ میں اضافہ کیا۔

علم کسی طبقہ سے مخصوص نہیں۔ علم کی متاع بے بہا کسی خاص طبقہ یا گروہ یا خاندان کے ساتھ مخصوص نہیں۔ ہر شخص اپنی استعداد یا صلاحیت کے مطابق اس سرمایہ سے بہرہ ور ہو سکتا ہے

اسلام میں نہ شودروں کی طرح کوئی ایسا راندۂ درگاہ فرقہ ہے جو علم کے قریب بھی نہیں بھٹک سکتا اور نہ برہمنوں کی طرح کوئی ایسا خاندان ہی مقرر کیا ہوا ہے کہ علم بس اسی طبقہ میں محدود ہو کر رہ جائے۔ اور اسی خاندان میں علم کی مکمل اجارہ داری ہو۔

برہمنوں اور شودروں کی تقسیم اگر ہندومت میں ہے تو اسی روایت کو مسیحی مذہب میں بھی قائم رکھا گیا ہے یہاں علم کا اجارہ طبقہ راہبوں اور پادریوں کا ہے جنہیں کلرجی   کہا جاتا ہے یہ مسیحی برہمن ہیں یہ علم اور مذہب کے اجارہ دار ہیں جو کچھ ان کی زبان سے نکلے وہ خدا کا حکم ہے اس کا انکار کفر اور راندۂ درگاہ ہونے کا باعث ہے۔ دوسرا طبقہ جو غیر پادریوں یا عوام پر مشتمل ہے اسے عوام PROFMNE کہا جاتا ہے یہ گویا عیسائیوں میں شودر یا نچلے درجے کے آدمی ہیں ان کا کام صرف پادریوں کا حکم بجا لانا ہے اگر اس بجا آوری میں انہیں تامل ہو یا کسی حکم کو یہ کہہ کر ٹال دیں کہ ان کی سمجھ سے بالاتر ہے یا عقل انسانی کے خلاف ہے تو انہیں دائرہ عیسائیت سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ ان کے لئے جنت اور نجات کے تمام راستے بند ہیں۔ لیکن اسلام میں ایسی کوئی طبقاتی تقسیم نہیں، علم دین کو حاصل کرنے میں عوام میں مساوات ہے۔ ہر شخص پر علم کے دروازے کھلے ہیں۔

لیکن اس جگہ ایک عام غلط فہمی کا ازالہ کر دینا نہایت ضروری ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام میں برہمنیت نہیں، اور دینی علم کو کسی خاص طبقہ تک محدود نہیں کیا جا سکتا تو بعض اصحاب اسے غلط معنی پہناتے ہیں اور اس کی غلط تعبیر کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ علماء کی جماعت کی کوئی ضرورت نہیں، یہ ان اصحاب کی شدید قسم کی بھول اور غلط فہمی ہے۔ برہمنیت کے عدم وجود سے مراد یہ ہے کہ علم کوئی موروثی یا خاندانی چیز نہیں اس کا مدعا یہ ہرگز نہیں کہ کسی فن میں اس کے ماہر یا عالم کو سند نہ مانا جائے اگر کوئی مریض کسی ڈاکٹر کے علاج سے مر جائے تو کسی غیر ڈاکٹر کو یہ حق ہرگز نہیں پہنچتا کہ ڈاکٹر کی جگہ چھین کر خود ڈاکٹر بن جائے اسی طرح اگر کسی عالم سے غلطی سرزد ہو جائے جو بشریت کا تقاضا ہے تو محض اس غلطی کی بنا پر کوئی شخص ان کی جگہ بننے کا حق دار نہیں بن جاتا جب تک ان کے برابر مستند علم حاصل نہ کر لے۔ اگر کوئی ناقص العلم آدمی اصحاب کمال سے برابری کا دعویٰ کرے تو علم کے سب شعبوں کو نقصان اٹھانا پڑے گا۔

اسلام کا پہلا مکتب - صُفّہ - اسلام کی تعلیم میں سب سے پہلا مکتب یا دارالعلوم یا یونیورسٹی صفہ تھا۔ اور یہاں جو لوگ علم حاصل کرنے کے لئے مقیم تھے انہیں اصحاب صفہ کہتے ہیں۔ یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود قائم فرمایا تھا صُفّہ کے لغوی معنی چبوترہ کے ہیں یہ مسجد نبوی کے اس حصہ میں تھا جو تحویل قبلہ کے حکم سے پہلے مسقف جگہ تھی اور قبلہ کی تبدیلی کے بعد اس کے بالمقابل بھی صحن مسجد میں چھت ڈال دی گئی تھی اور پہلی مسقف جگہ کو مکتب اور دارالعلوم میں تبدیل کر دیا گیا تھا یہ طلباء کی سکونت گاہ تھی، صفہ رہائشی مکتب تھا۔ یہ پہلی اسلامی یونیورسٹی تھی اس مکتب سے عصر حاضر کے مدرسے اور تدریسی ادارے کچھ بھی نسبت نہیں رکھتے۔ اس کا عالم ہی اور تھا۔ یہاں علم اور عمل دونوں کی عملی تربیت دی جاتی تھی اور اس عظیم الشان درسگاہ کا طرۂ امتیاز فقر تھا، اور طلباء کو براہ راست معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات سے فیض حاصل کرنے کا فخر حاصل تھا۔ یہ ہر وقت حضورؐ کی صحبت میں رہتے تھے، کیونکہ انہیں دنیا کا کوئی اور کام نہ تھا ان کی تعلیم قرآن حکیم تفسیر فقہ۔ حدیث تک محدود نہ تھی بلکہ وہ جو کچھ پڑھتے تھے اس کی عملی تربیت بھی حاصل کرتے تھے۔

اصحاب صُفہ کو اس درس گاہ میں داخلہ کے لئے زر و سیم اور سامانِ راحت کی حاجت نہ تھی فقر ہی ان کا سرمایہ اور قناعت ان کا شعار تھا لیکن ایک لگن تھی اور ایک عشق تھا لگن دولت علم سمیٹنے کی اور عشق حضوری دربار مصطفیٰ کا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ وہ اپنی گذر اوقات اور خورد و نوش کے لئے گداگری کرتے تھے یا دوسروں کے دست نگر رہتے تھے اور باقی صحابہ سے خیرات کے طالب تھے۔ ان حضرات سے جہاں تک ہو سکتا، محنت مزدوری کرتے اور جو اجرت ملتی اس سے ضروریات بہم پہنچاتے اور وہ ضرورت قوت لایموت اور ستر عورت کے ڈھانپنے تک ہی محدود تھی اگر ان سے کچھ بچ رہتا تو یا تو اپنے ہم سبق اصحاب صُفہ کے کام آتا یا صدقہ میں نکل جاتا اپنے پاس ذخیرہ رکھنا ان کے لئے امر محال تھا، ان پر بارہا فاقے گذر جاتے اکثر اوقات تین تین دن تک ایک دانہ بھی ان کے منہ میں نہ جاتا لیکن وہ قناعت کے مجسمے تھے بعض

دفعہ بھوک سے نڈھال ہو کر عین حالت نماز میں گر جاتے ناواقف لوگ خیال کرتے کہ شاید دیوانے ہیں۔ اور یہ لقب شاید کسی حد تک ان کے لیے درست بھی تھا جو شخص کسی نصب العین کے پیچھے اپنے وجود کو گم کرے اور اسے بس ایک ہی لگن ہو وہ دیوانہ نہیں تو اور کیا ہوتا ہے لیکن ایسی دیوانگی پر ہزار ہوشیاریاں قربان کی جا سکتی ہیں۔ یہ عشق رسولؐ اور علم کی تشنگی اور لگن کی دیوانگی تھی۔ بجائے دیوانے کے انہیں مجذوب کا لقب دینا زیادہ موزوں ہے۔

انہوں نے علم و حکمت کے دائرے کو دُور دور پھیلایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم انہیں نو مسلم قبائل میں تعلیم مسائل کے لئے اکثر بھیجا کرتے تھے۔ اسلام نیا نیا پھیل رہا تھا اور عرب کے چپے چپے میں اسلام کے دشمن چھپے بیٹھے تھے اور اپنی اسلام دشمنی سرگرمیوں کے لئے کوئی شکار تلاش کرنا ان کا مشغلہ تھا۔

اصحاب صُفّہ کی جان اکثر خطرے میں رہتی تھی تاہم یہ شمع نبوت کے پروانے ان تمام باتوں کی پروا کئے بغیر ادائیگی فرض کے لئے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اپنے فرائض بجالانے سے گریز نہ کرتے تھے۔ ان مہمات میں کئی اصحاب صُفّہ جام شہادت بھی نوش کر گئے تھے۔

اصحاب صُفّہ صرف راہ علم کے جادہ پیمانہ تھے بلکہ میدان جہاد میں پیش پیش تھے۔ وہ غزوات اور مہمات میں بھی حصہ لیتے تھے اور سپاہیانہ جوہر بھی اکثر دکھایا کرتے یہ ہے عہد نبویؐ میں علمی سرگرمیوں پر تبصرہ کا ایک پہلو۔ اس کے علاوہ اور کئی مکاتیب اور درس گاہیں بھی قائم تھیں۔ لیکن اصحاب صُفّہ ہی کی طرز پر تھیں اور عموماً مساجد ہی ان کے مرکز تھے۔

خلافت راشدہ ۔ خلافت راشدہ کا دور آیا تو تعلیم و تدریس کے میدان میں وسعت ہوئی بچوں کو قرآن کی تعلیم۔ کتابت۔ اخلاقی اشعار۔ امثال عرب وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی معلمین کے لئے حکومت کی طرف سے تنخواہیں مقرر تھیں۔ بچوں کی تعلیم کے علاوہ تعلیم بالغان کا بھی اہتمام تھا فقہ کی تعلیم کے لئے ہر صوبہ میں تنخواہ دار

فقہا اور معلمین روانہ کئے جاتے تھے، جو مساجد میں بیٹھ کر تعلیم دیتے تھے اور گوناگوں حلقہ ہائے درس ان کے وجود کی وجہ سے عوام اور طلبار کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے ایک ایک فقیہہ کے پاس ہزاروں کا مجمع ہوتا تھا۔

جو لوگ تجارت اور مختلف کاروبار کرتے تھے، حضرت عمرؓ انہیں مجبور کرتے تھے کہ اپنے کاروباری شعبے کے بارے میں فقہی مسائل سیکھیں۔ اگر وہ دوکانداروں یا تاجروں میں فقہ کی بنیادی معلومات کی کمی محسوس کرتے تو کوڑوں سے ان کی تواضع کی جاتی اور علم حاصل کرنے کے لئے اساتذہ کے پاس بھیجتے تھے اگر کاروباری اصحاب فقہی مسائل سے آگاہ نہ ہوں تو عین ممکن ہے کہ وہ ناجائز ذرائع استعمال کرکے تجارت کے اسلامی اصولوں کی خلاف ورزی کرنے لگیں۔

خلافتِ راشدہ کے بعد۔ خلافت راشدہ کے بعد بنی امیہ اور بنی عباس کا دور آیا ان دو عہدوں میں علوم و فنون نے جو ترقی کی اور جس طرح مسلمان تمام دنیا کے لئے مینار روشنی بن کر چمکنے لگے اور جس طرح حکمت و فلسفہ دینوی علوم وغیرہ میں ان قرون اولیٰ کے مسلمان علمار و مشائخ اور اماں عالی مقام نے جدوجہد کی یہ تمام باتیں اسلامی تاریخ کا ایک جزو ہیں۔ اکثر اوقات سلاطین اور امرا سے زیادہ علمار اور ائمہ دین کی کوششیں بہت نمایاں اور درخشاں مقام رکھتی ہیں علمار اور آئمہ نے اپنی زندگیاں علم کی اشاعت اور تبلیغ دین کے لئے وقف کردیں۔

بعض امرا اور سلاطین اور خلفا نے بھی فروغ علم میں ذاتی دلچسپی لی امیر معاویہ نے شاہی کتب خانہ قائم کیا اور اُن کے پوتے خالد بن یزید نے علم و حکمت پھیلانے میں بہت جدوجہد کی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے کارنامے دولت امویہ میں سب سے بڑھ کر تھے انہوں نے حدیث فقہ اور تفسیری علوم کے علاوہ دینوی علوم کی اشاعت میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں اس کے علاوہ نادار طلبہ اور ان علمار کے لئے جنہوں نے منظور کیا وظائف جاری کئے۔

ہارون الرشید کو تحصیل علم کا اس قدر شوق تھا کہ بغداد سے چل کر مدینہ منورہ میں

امام مالکؒ کے پاس حدیث سننے آیا۔ ایک درس میں شامل ہونے جاتا تو کھجور کے ایک تنے پر بیٹھ کر عام طلبہ کے ہمراہ حدیث لکھتا تھا۔ عباسی خلفائے علم کے پودے کی آب یاری اور پرورش جائے عزیز کی طرح کی دارالخلافہ بغداد میں دنیا بھر سے علماء اکٹھے کئے۔ یہاں تقریباً بیس مدرسے تعمیر کئے تھے جو محلات کی وسعت اور شان رکھتے تھے۔

تعلیم کی اشاعت میں اصحاب ثروت نے بھی بڑی دلچسپی لی اور ذاتی خرچ سے بہت سے وسیع مدرسے ان کے ساتھ بڑے بڑے وقف قائم کئے جن سے لاکھوں کی آمدنی تھی طلبہ کی رہائش اور خوراک کا بھی انتظام ہوتا تھا۔ شفاخانے بھی ملحق تھے۔ ہزاروں کتابیں بھی موجود تھیں مستند اور نامور علماء کو ان مدرسوں کی زمام تعلیم اور انتظام سونپا جاتا تھا، طلبا دور دراز سے سفر کر کے ان مدرسوں میں آتے تھے۔

ملت اسلامیہ میں علم کا نظام قائم کرنا ہی اس کے فرزندوں کی ذاتی کاوشوں ہی سے قائم رہا ہے۔ اس نظام کو زندہ و مستحکم رکھنے کے لئے نقطۂ عالی روح کی ضرورت تھی جس سے اسلامی دنیا کا کوئی گوشہ خالی نہ تھا۔ اب جبکہ حکومت کے فرائض کا دائرہ بہت پھیل گیا ہے نظام تعلیم بھی حکومت کے فرائض میں شامل ہے۔ یہ نظام بھی صحیح معنوں میں کامیاب ہو سکتا ہے کہ ملت اسلامیہ کا ہر فرد اس کا خیر خواہ اور اس میں ہر ممکن طریق سے ممد و معاون ہو۔ اور اسے خوب سے خوب تر دیکھنے کا آرزو مند ہو۔

اسلامی تعلیم کا نصب العین ۔ کوئی کوشش اس وقت تک بار آور نہیں ہو سکتی جب تک اس کا نصب العین متعین نہ ہو۔ بغیر کسی مقصد کے جو کام بھی کیا جائیگا عبث ہوگا۔ اس لئے ضروری ہے کہ اسلامی تعلیم کا نصب العین واضح کر دیا جائے۔ اسلامی تعلیم کا نصب العین بہت وسیع ہے۔ اس کا مقصود صرف حروف و الفاظ سے آشنا ہونا نہیں، بلکہ دین کی خدمت ہے یعنی پوری اسلامی زندگی کی تعمیر۔

اسلامی تعلیم فرد کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ دین کی اشاعت و حفاظت کی عظیم مہم میں حصہ لے سکے۔ زندگی کے دو پہلو ہیں یعنی روحانی اور دنیوی۔ عملی طور پر روحانیت کو دنیاداری سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن نظری نقطۂ نگاہ سے ہم ان پر الگ الگ بحث کر سکتے ہیں۔

روحانیت ۔ اسلامی تعلیم روحانی اور اخلاقی طور سے کامل تربیت دیتی ہے۔ یہ مقصد محض کتابوں سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے شخصی نظیر اور تربیت کی بھی برابر کی حاجت ہوتی ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ معلم اخلاقی اوصاف سے مالامال ہو۔ اگر معلم اخلاقی جوہر سے خالی ہو تو شاگردوں کے اخلاق پر ان کا ضرور عکس پڑے گا اور اس طرح شاگرد بھی اخلاقی گراوٹ میں پڑیں گے اور علم کی قدر و منزلت کو گنوا دینگے۔

دُنیاداری ۔ دُنیا کا کاروبار نہایت وسیع اور پیچیدہ ہے۔ اس کے لئے متعدد علوم مدون کئے گئے ہیں مثلاً سائنس ریاضی انجینئرنگ اگرچہ ہم ان کو دنیوی علوم کا نام دیتے ہیں لیکن ان علوم کو اگر دینی خدمت کے جذبے سے حاصل کیا جائے اور ان سے محض تن پروری مقصود نہ ہو تو یہ بھی حدیث نبویؐ کے مطابق اللہ تعالےٰ کی نگاہ میں مقبول ہوتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ۔ یعنی تمام کاموں کی بنیاد نیت پر مبنی ہے۔

ہاں ایسے علوم سے پرہیز لازم ہے جن سے دین یا مُلک کو نقصان پہنچے۔

اسلام علوم و فنون کا بہت حامی ہے۔ مسلمانوں نے متعدد علوم میں مجتہدانہ اقدام کئے اور کئی علم و فن ایجاد کئے اور اس سے ملک و ملت کی خدمت کا کام لیا لیکن یہ ضروری ہے کہ آدمی ان علوم میں اتنا نہ کھو جائے کہ روحانیت کو بھلا بیٹھے اور دین کے تقاضوں سے غافل ہو جائے۔

طالب علم کے اوصاف ۔ (طالب علم کو مندرجہ ذیل صفات کا حامل ہونا ضروری ہے)

۱۔ **خوفِ خدا** ۔ خدا کا خوف علم کا سرچشمہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

رَاْسُ الْحِکْمَۃِ مَخَافَۃُ اللّٰہِ یعنی تمام حکمتوں اور فنون کا سرچشمہ حکیم مطلق

خداوند کریم کا خوف ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے۔ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا ط۔

بیشک اللہ سے ڈرنے والے اس کے عالم بندے ہیں۔

جس علم کا آغاز خوفِ خدا سے نہیں ہوتا وہ رحمانی نہیں بلکہ شیطانی ہے۔ اس کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔

۲۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت :۔

مسلمان اس وقت تک سچا مسلمان نہیں ہوتا جب تک وہ سید المرسلین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اپنے دل گہرائیوں میں محسوس نہ کرے اور حضور کو اپنی جان اور اپنے والدین سے بھی عزیز نہ سمجھے۔

۳۔ دین وشریعت کی پابندی :۔

ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنی تمام خواہشات کو دین وشرع مبین کے تابع کر دے اور اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کرے ان تعلیمات پر عمل کرنے کے لئے اسلامی درس گاہیں تربیت گاہ کا کام دیتی ہیں۔

۴۔ قوم سے محبت :۔

مکتبی زندگی کے دوران طالب علم کے ذہن میں قوم کی محبت راسخ ہو جانی چاہئے۔ طالب علم پر یہ نکتہ خوب عیاں ہو جائے کہ فرد کی زندگی قومی حیات سے وابستہ ہے۔ صحیح مسلمان وہ ہے جو دین کے ساتھ قوم اور ملت سے بھی محبت رکھتا ہے اور اس کے فائدہ کو اپنا فائدہ اور نقصان کو اپنا نقصان سمجھتا ہے۔

۵۔ حکومت کی اطاعت۔

اسلامی حکومت کی اطاعت کی اسلام میں بہت تاکید ہے۔ حکومت کے مسائل اور مصلحتوں کو سمجھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں اس لئے حکومت کے ہر قسم کی وضاحت طلب کرنا منع ہے۔ حکومت سے حتی الوسع تعاون کرنا ضروری ہے۔ اگر حکومت سے تعاون کا جذبہ طلبہ کے ذہن میں راسخ نہیں ہو گا تو ملک وملت کے دشمن عناصر

ان کے ناپختہ اذہان پر اثر انداز ہو کر ان کو مظاہروں اور ہنگاموں کی راہ پر چلا دینگے۔ جس سے ملک و ملت کی سالمیت خطرے میں پڑ جائے گی۔

۶- اسلامی ثقافت۔

اسلام اپنے متبعین کے لئے زندگی کا ایک خاص سلیقہ مقرر کرتا ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں ثقافت کہتے ہیں۔ اسلامی ثقافت اسلام کی امتیازی شان کی مظہر ہے مسلمان کو اپنی ثقافت اور تہذیب پر ناز ہے اس ثقافت کی روح سادگی اور پاکیزگی پر قائم ہے۔ یہ اُسے نشست و برخاست کے اور رہن سہن کے ایسے اسلوب سکھاتی ہے جو کسی خاص طبقہ سے مخصوص نہیں ہوتے امیر غریب حاکم و محکوم سب انہیں اپنا سکتے ہیں۔ مختلف طبقات کے درمیان مغایرت پیدا نہیں ہونے پاتی وہ آپس میں بغیر تکلیف کے میل جول پیدا کر سکتے ہیں یہ ثقافت ہمدردی مساوات اور سادگی کے دم سے قائم رہتی ہے اسلامی ثقافت ہمیں یہ تعلیم دیتی ہے کہ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں ان میں ہمدردی ہونی چاہئے وہ دولت کو فضول اور بے کار سامان عیش پر ضائع نہ کریں اور اسے اپنے بھائیوں کے فائدے کے لئے خرچ کریں۔

اسلامی ثقافت عیش پرستی اور عافیت کوشی سے بچاتی اور زندگی کی دوڑ میں مشقت اور جہد و جہد اور محنت پر ابھارتی ہے۔ جو طالب علم مکتب کی زندگی میں عیش کوش اور راحت طلب اور عافیت پسند ہو جائیں وہ قوم کے لئے وبال بن جاتے ہیں۔

مسجد و مکتب :-

علم ایک مذہبی فریضہ ہے۔ اس میں مکتب کے ساتھ مسجد کا وجود ضروری ہے اور مسجد و مکتب دونوں کا باہم تعاون لازمی ہے اس تعاون سے مکتب میں بھی ایک شان تقدس پیدا ہو جاتی ہے جو اس کے مذہبی فریضہ ہونے کا تقاضا ہے شروع میں مسجدیں ہی مکاتیب کا کام دیتی تھیں جب بعد میں کہیں کہیں درسگاہیں علیحدہ ہو گئیں تو ان میں بھی مساجد کا تقدس پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔

باب (۱۹)

مسجد

مسجد کے لغوی معنی ہیں سجدہ گاہ اس لحاظ سے ہر وہ جگہ مسجد ہے جہاں ایک مسلمان بندہ اللہ تعالٰی کے حضور میں سجدہ کرتا ہے۔ ہر پاک جگہ مسلمان کی سجدہ گاہ ہو سکتی ہے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہمارے لئے ساری زمین مسجد بنا دی گئی ہے۔

اصطلاح میں مسجد اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں باجماعت نماز مستقل طور پر پڑھی جائے۔ اور جو صرف نماز کے لئے وقف ہو۔

مقاصد۔

مسلمان پر پانچ وقت نماز فرض ہے سوائے مجبوری کے گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں اذان سنتے ہی محلہ کی مسجد میں نماز باجماعت پڑھنے کے لئے مستعد ہو جانا چاہیئے۔

مسجد کے امام سے توقع رکھی جاتی ہے کہ علم دین سے واقف ہے وہ محلہ کے بچوں کو دین کی ابتدائی تعلیم دیتا ہے۔ اہل محلہ کے مسائل اسلام میں رہنمائی کرتا ہے اور اگر ضرورت ہو تو فتویٰ صادر کرتا ہے۔ مسجد سے ہر مسلمان کا گہرا تعلق ہے وہ اس کی زندگی میں مرکزی مقام رکھتی ہے۔

مسجد روحانی پاکیزگی اخلاقی طہارت' بدنی پاکیزگی اور ماحول کی صفائی کی تصویر پیش کرتی ہے۔ مسجد نور کا مسکن ہے اللہ تعالٰی نے سورہ نور میں اپنی ذات کو نور سے تشبیہہ دی ہے۔ اور بتایا ہے کہ نور کی ارضی جلوہ گاہیں مساجد ہیں حضرت

حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ مسجدیں اللہ کے گھر ہیں۔ آسمان والوں تک ان کا نور اس طرح پہنچتا ہے جیسے ستاروں کا نور اہل زمین تک (تفسیر خازن) جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بستیوں میں محبوب ترین جگہیں مساجد ہیں۔

مسجد کا اولین مقصد بے شک پنج وقتہ نماز ہے لیکن اس کے مقاصد اور فوائد کو صرف پنج وقتہ نماز تک محدود نہیں رکھا گیا۔ چھوٹے بڑے درسی اور ملی اجتماع آئے دن مساجد میں ہوتے رہتے ہیں اور قرون اولیٰ میں تو اکثر ہوا کرتے تھے جن میں ائمہ کرام بنفس نفیس شریک ہوا کرتے تھے۔

مسجد مسلمان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے مندرجہ عنوان کے ماتحت ان کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

۱۔ عبادت کی گہرائی۔

عبادت اکیلے بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اجتماعی شکل میں عبادت کرنے کا دل پر گہرا اثر پڑتا ہے سب افراد ایک دوسرے سے اثر اندوز ہوتے ہیں اور دل کی محویت افزوں تر ہوتی ہے۔

۲۔ مسجد دینی شعار ہے۔

مسجد دین اسلام کی ایک درخشاں علامت ہے اس کی عمارت میں سادگی کے باوصف ایک پرزور کشش ہوتی ہے۔ جو ہمارے دلوں کو دین کی طرف کھینچتی ہے مسجد کے ساتھ ایک خاص تقدس وابستہ ہوتا ہے اس کو دیکھتے ہی دل میں احترام اور محبت کے جذبات بیدار ہوتے ہیں۔

نیز قومی یا دینی شعار قوم و ملت کی خودی اور خود آگاہی کو برقرار رکھنے میں اہم حصہ لیتے ہیں۔ ہر قوم اپنے شعار سے محبت کرتی ہے اور اس کی آن پر جان تک نچھاور کر دیتی ہے۔ یہ اس کی غیرت ملی کا ثبوت ہوتا ہے ہر حساس اور غیرت مند مسلمان کو مسجد سے محبت ہوتی ہے وہ اس کی شان کو بلند سے بلند تر دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کی نگاہ جب سرفراز میناروں کی طرف جاتی ہے تو اس کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔ مغربی پاکستان میں جب کوئی سیاح لاہور آتا ہے تو ہم نہایت مسرت

اور فخر سے اسے شاہی مسجد کی شان و شکوہ کا نظارہ کراتے ہیں۔
ولید اول نے جامع دمشق پر لاکھوں روپیہ خرچ کیا۔ اور اُسے سونے چاندی سے لیپ دیا۔ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز سادگی پسند تھے وہ خلیفہ ہوئے تو چاہا کہ مسجد کی زائد از ضرورت زینت اور سونے چاندی کو اُتار کر عوامی مصرف میں لائیں۔ کسی نے بتایا کہ ایک عیسائی زائر اسے دیکھ کر بیہوش ہوگیا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر اس کی شان اغیار کے لئے اس قدر ہیبت انگیز ہے تو اسے اپنے حال پر رہنے دو۔
مسجد سے پانچ وقت اذان کی غلغلہ انگیز صدا اٹھتی ہے۔ اذان بھی اسلام کا ایک ممتاز شعار ہے۔ یہ سطوت اسلام کا مظہر ہے۔ مسلمان کے دل میں تکبیر کا ہر نیا غلغلہ ایمان کا ایک تازہ جوش پیدا کرتا ہے۔ ادھر اسلام کے دشمنوں کا یہ حال ہے کہ اذان کی آواز پر تلملا اُٹھتے ہیں۔ تاریخ اسلام میں ایسے لمحات کی کمی نہیں جب ہم نے اعداد کی مہیب فوجوں کو صرف تکبیر کے نعروں سے لرزا کر مغلوب کر لیا۔

۳۔ مسجد مسلمان کا پہلا مکتب ہے۔

جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام میں پہلا مدرسہ مسجد نبوی ہی میں قائم کیا تھا اس کو صفّہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ کی زندگی میں ہی مدینہ منورہ میں اور بھی کئی مسجدیں بن گئی تھیں جن میں بچوں کو تعلیم دی جاتی تھی۔
مسلمان بچے کو سب سے پہلے جس کی تعلیم دی جاتی ہے۔ وہ قرآن پاک ہے ابن خلدون کہتے ہیں۔ کہ قرآن حکیم کی تعلیم اہل اسلام کا شعار ہے اسلام کی تقریباً پہلی تین صدیوں میں مسجد ہی درس گاہ ہوتی تھی جب نئی درس گاہ کی ضرورت ہوتی تو ایک اور مسجد بنا لیتے۔ یعنی عبادت اور تعلیم اسلام میں لازم و ملزوم ہیں۔ چوتھی صدی ہجری میں جاکر الگ مدرسوں کا اہتمام کیا جانے لگا۔ ہر مسجد کے ساتھ عام طور پر کمرے ہوتے ہیں یہ طلبار کی اقامت گاہ کا کام دیتے ہیں یہاں جو نادار طلبہ قیام کرتے ہیں قوم کی طرف سے یا حکومت سے ان کے اخراجات کا بھی انتظام کیا جاتا ہے۔
۴۔ اسلامی ثقافت :۔ مسجد اسلامی ثقافت سے بہرہ مند ہے۔ اسلام کی تعلیم میں

روح رواں تین چیزیں ہیں۔
پاکیزگی
سادگی
مساوات اور ہمدردی۔
ان تینوں کی تعلیم کا آغاز در تکمیل مسجد میں ہی ہوتی ہے۔
پاکیزگی :۔
نماز کے لیئے وضو لازم ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پاکیزگی کو ایمان کا جزو قرار دیا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ اگر میں اپنی اُمت پریشان نہ جانتا تو ہر نماز کے لئے مسواک ضروری قرار دیتا۔
مسجد میں نمازی اس بات کا اہتمام کرتے ہیں کہ کپڑے پاکیزہ ہوں جسم پہ کوئی غلاظت نہ ہو اور نماز کی جگہ صاف ستھری ہو۔ اس پنج وقتہ اہتمام سے دل میں پاکیزگی کا جذبہ راسخ ہو جاتا ہے۔
سادگی ۔
نماز ادا کرتے وقت سب تکلفات برطرف کر دیئے جاتے ہیں ریشمی لباس اور طلائی انگوٹھی وغیرہ سے بھی احتراز کرنے کا حکم ہے ورنہ نماز کا حق ادا نہیں ہوتا۔ مسجد میں اٹھنا بیٹھنا نہایت سادگی سے ہوتا ہے اللہ کے حضور میں ہر شخص چاہتا ہے کہ سادہ لباس اور سادہ ہیئت سے جائے۔
مساوات اور ہمدردی۔
مسجد میں ہر طبقہ اور ہر خاندان کے لوگ ہر حیثیت کے آدمی ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر اللہ کے دربار میں سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ امیر غریب حاکم و محکوم کی تمیز بھی اٹھ جاتی ہے کسی آدمی کے لئے لازم نہیں کہ امیر یا صاحب حیثیت کے لئے جگہ خالی کرے اصحاب مرتبہ اور ارباب دولت کے دماغ سے کبر و نخوت کا نشہ اگر مٹ نہ جائے تو کم ضرور ہو جاتا ہے۔
آداب کی تعلیم :۔ مسجد میں متفرق آداب بالخصوص معاشرتی آداب کی نہایت مستحکم

تعلیم ملتی ہے ہر شخص نہایت مؤدب ہو کر مسجد میں داخل ہوتا ہے۔ بھاگنے کی اجازت نہیں خواہ نماز کا وقت نکل رہا ہو۔ سلیقہ اور وقار کے ساتھ آنے کا حکم ہے۔ نماز بذات خود سلیقہ اور خوش اطواری کی منظہر ہے۔

پابندیٔ اوقات :-

نماز باجماعت کے اوقات مقرر ہیں کسی رئیس کے انتظار کے لئے اوقات میں کمی بیشی نہیں کی جاتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بہترین وقت مقرر کی نماز ہے۔ اذان کی آواز کان میں پڑتے ہی نماز کے لیے مستعد ہو جانا چاہئے اور وقت پر چل کر جماعت کے ساتھ شامل ہو جانا چاہئے۔ نماز میں پابندی وقت نہایت ضروری ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ اذان کے بعد جاؤں اور جو لوگ گھروں میں بیٹھے ہیں ان کے گھروں کو آگ لگا دوں۔

تنظیم :-

نماز باجماعت تنظیم کی بہترین مثال ہے۔ شانہ سے شانہ لگا کر نہایت خوش ترتیبی سے صف بندی کی جاتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ صفیں سیدھی رکھو ورنہ تمہارے دلوں میں اختلاف ہو جائے گا۔ آپؐ نے نماز کی تکمیل اور حسن ادائیگی کے لئے سیدھی صف کو شرط قرار دیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے صفیں درست کرنے کے لئے تنخواہ دار ملازم رکھے ہوئے تھے۔

ساری جماعت خوش دلی سے محض اللہ تعالےٰ کی رضا کی خاطر ایک امام کی اطاعت کرتی ہے۔

قعدہ، قیام، سجدہ اور تسلیم وغیرہ میں امام سے پہل کرنے کی سخت ممانعت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تمہیں اس بات کا خوف نہیں کہ جو آدمی امام سے پہلے سر اٹھائے اللہ اس کے سر کو گدھے یا بیل کا سر بنا دے۔

نماز میں انتہائی خاموشی اور سکون کا مظاہرہ ہوتا ہے نماز کے دوران میں ہی نہیں امام کے خطبہ کے درمیان بھی بولنا سخت منع ہے۔ اگر کوئی دوسرا آدمی

بول اٹھے تو سے اشارہ سے منع کیا جائے۔

جناب ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب جمعہ کے روز امام خطبہ دے رہا ہو اور تو اپنے ساتھی سے کہے کہ چپکا ہو رہ۔ تو تو لغو حرکت کرتا ہے مطلب یہ ہے کہ اسے اشارہ سے منع کیا جائے۔

۸۔ خود ضبطی :-

مسجد میں آداب و قواعد کی جو پابندی کی جاتی ہے وہ کسی قانونی گرفت کے خوف سے نہیں بلکہ صرف تقویٰ کے جذبات کے تحت کی جاتی ہے۔ اس سے خود ضبطی کی تربیت ہوتی ہے۔ انسان میں اپنے جذبات اور خواہشات کو قابو میں رکھنے کی استعداد پیدا ہوتی ہے، اور وہ معاشرتی اور حکومت کی پابندیوں کو بھی خوشی سے برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

۹۔ شیرازہ بندی۔

مسجد میں آنے والے تمام افراد ایک ہی نصب العین کے پابند ہوتے ہیں۔ اس لئے یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ جو اخوت کا سنگِ بنیاد ہے ناآشناؤں میں شناسائی ہوتی ہے ایک دوسرے کے دُکھ درد میں اور ان کے گوناگوں مسائل کے حل کے لئے ساز گار فضا پیدا ہوتی ہے۔ تعاون کا جذبہ بڑھتا ہے تسبیح کے بکھرے ہوئے دانوں کی شیرازہ بندی ہوتی ہے اور رشتۂ اخوت مضبوط سے مضبوط تر ہو جاتا ہے۔

۱۰۔ ملی شکوہ

جماعتی شیرازہ بندی سے اپنے بیگانے ہر ایک کو یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ ملتِ اسلامیہ میں کس قدر اخوت اور ہمدردی ہے۔ اہلِ اسلام کے ملی شکوہ اور شان کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ ان کی ہمت بلند ہوتی ہے اور اغیار مرعوب ہوتے ہیں۔

۱۱۔ روح اور مادہ میں توازن۔

مسجد انسان کی کاروباری مصروفیتوں کی یک رُخی کو مٹا کر کاروبار اور

عبادت میں صحیح توازن پیدا کرتی ہے۔
دل ہر وقت دُنیا کے دھندوں میں اُلجھا نہیں رہتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کو بھی یاد کر لیتا ہے۔ اس سے کاروباری زندگی میں نیکی کا عنصر غالب رہتا ہے۔

باب (۲۰)

مکتب

مفہوم :۔ مکتب یا مدرسہ تعلیم کی جگہ کو کہتے ہیں۔ بعض اہل علم کے نزدیک مکتب ابتدائی درسگاہ اور مدرسہ بڑی درس گاہ کے معنی رکھتے ہیں۔ لیکن یہ فرق ضروری نہیں بالخصوص موجودہ دور میں مکتب اور مدرسہ ایک ہی معنی میں مستعمل ہیں۔

اہمیت :۔ قوموں کی تاریخ میں مکتب کو نہایت بلند اور معزز مقام حاصل ہوتا ہے اقوام اپنے ممتاز مکاتیب اور ان کے تعلیمی کارناموں پر ناز کرتی ہیں۔ اچھے مکاتیب کا تاریخ پر گہرا اثر ہوتا ہے وہ قوم کو نئی زندگی اور نئی حرکت عطا کرتے ہیں ان سے جو علماء فارغ ہو کر نکلتے ہیں وہ تعمیری کارناموں میں نہایت اہم حصہ لیتے ہیں درس نظامیہ یا جامعہ نظامیہ جو آج سے سینکڑوں سال پہلے بغداد میں قائم ہوا تھا اس کا نام نہایت فخر سے لیا جاتا ہے اسی طرح جامعہ ازہر اور دارالعلوم دیوبند نے بھی قوم کی تاریخ پر دیرپا اثرات چھوڑے ہیں ہندوستان کی آزادی میں ہمارے بعض دینی مدرسوں اور دارالعلوم کے معلمین اور فارغ التحصیل مجاہدین نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔

مدرسہ سے اس کے فارغ التحصیل طلبہ کو عمر بھر عقیدت رہتی ہے۔ وہ مدرسہ کی زندگی اور اساتذہ کا جب بھی خیال کرتے ہیں ان کے سینے فرط عقیدت اور محبت کے جذبات سے لبریز ہو جاتے ہیں۔

طالب علمی کے زمانہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے یہ تصویر ہمیشہ دل کے کسی گوشے میں محفوظ پڑی رہتی ہے۔ اور انسان کے خیالات اور احساسات پر گہرا اثر ڈالتی رہتی ہے۔ مکتب انسانی زندگی کے کئی پہلو تعمیر کرتا ہے۔ مثلاً

۱۔ علم ۔ ۲۔ اخوت
۳۔ نظم و ضبط ۔ ۴۔ آداب
۵۔ استاد کا اخلاقی اثر
۶۔ جسمانی تندرستی ۔ ۷۔ گھریلو زندگی کی تربیت

۱۔ علم ۔

علم کا اکتساب یوں تو گھر پر بھی اُستاد کی زیرِ نگرانی ممکن ہے اور کتابیں خرید کر ذاتی طور سے بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جماعت میں بیٹھ کر علم حاصل کرنے کے جو فوائد ہیں وہ انفرادی تعلیم میں نہیں۔ بچے کو تنہا بٹھا کر پڑھنے پر مجبور کیا جائے تو وہ اُکتا جاتا ہے اور اُسے پڑھائی سے وحشت ہونے لگتی ہے۔ بچے طبعاً جماعت پسند ہوتے ہیں بالخصوص ہم عمر بچوں کی صحبت میں وہ چہک اُٹھتے ہیں اور اُن کے قویٰ جولانی دکھانے لگتے ہیں۔ بچے کی ذہنی اور بدنی صلاحیتیں اس کے ہم عمر لڑکوں میں پروان چڑھتی ہیں۔ اگر اُس کو باقی ساتھیوں سے الگ رکھا جائے تو اس کی زندگی مقید سی ہو جاتی ہے۔ اس کی شخصیت میں وسعت پیدا نہیں ہوتی سلاطین اپنے بچوں کی تعلیم کا انتظام محل میں خاص اساتذہ کے زیر اہتمام کرتے تھے لیکن یہ کوشش ہوتی تھی کہ ان کے ساتھ ہم عمر اور ہم سبق بچے بھی شامل ہوں چاہے یہ بچے شاہی خاندان اور اُمراء کے ہوں۔

بچے کو جب شروع میں علم پر لگایا جاتا ہے تو اس کی آزاد رو طبیعت علم کو ایک بڑا بوجھ سمجھتی ہے اگر اسی کے کندھے پر یہ عظیم بوجھ رکھ کر اسے تنہا بٹھا دیا جائے تو وہ سمجھتا ہے کہ پہاڑ کے نیچے پسا جا رہا ہوں۔ لیکن وہ جب جماعت میں آکر شریک ہوتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ زندگی کی اس مہم میں وہ اکیلا نہیں سینکڑوں اس کے

رفیق ہیں وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کے ہم جماعت ساتھی اس کا بوجھ ہلکا کر رہے ہیں یہ بوجھ صرف خیالی طور پر ہلکا نہیں ہوتا بلکہ حقیقتاً ہوتا ہے۔ مثلاً سبق یاد کرنے کے کئی طریقے ہوتے ہیں بار ہا ایک بات کو کتاب سے بار بار پڑھتے ہیں۔ لیکن وہ حافظہ میں نہیں بیٹھتی لیکن اسے دوسرے کی زبان سے سُنتے ہیں تو ہمیشہ کے لئے ازبر ہو جاتی ہے۔ طالب علم اپنے ساتھیوں کی زبان سے جو سُنتا ہے وہ آسانی سے بلاکوفت اس کے ذہن میں اُتر جاتا ہے۔ اور محفوظ ہو جاتا ہے۔ مکتب میں طلبار کے باہم دَور کرنے کا عام رواج ہے اس دَور کو تکرار کرنا بھی کہتے ہیں۔ اس کے بیش بہا فوائد ہیں۔ اس سے طلبار دَور کی یادداشت اور فہم دونوں پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ طبیعت پر بوجھ نہیں ہوتا اور سبق میں جی لگتا ہے علم سے رغبت پیدا ہوتی ہے بلکہ روح میں سما جاتا ہے۔

قرآن کریم کو آدمی اکیلے بیٹھ کر پڑھے تو بے شک اس کی تلاوت سے روح پر کیف ہوتی ہے۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب ہم دوسروں کی زبان سے یہ کلام سُنتے ہیں تو طبیعت پر ایک دوسرا ہی عالم طاری ہو جاتا ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم بار ہا کسی صحابی کو حکم دیتے کہ قرآن مجید کی تلاوت کرو' اور ان کی زبان سے کلام الٰہی سُن کر خوب لطف اُٹھاتے ہر سال رمضان کے مہینہ میں جبرئیل علیہ السلام تشریف لاتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرآن حکیم کا دور کرتے آپ کا ارشاد ہے کہ جب بھی کچھ لوگ مسجد میں جمع ہوتے ہیں قرآن حکیم کی تلاوت کرتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کو پڑھاتے ہیں تو ان پر اللہ کی طرف سے سکون نازل ہوتا ہے۔ اللہ کی رحمت ان پر نازل ہوتی ہے۔ اور فرشتے ان پر سایہ کرتے ہیں اور اللہ اپنے مقربین میں ان کو یاد کرتا ہے۔

قرآن حکیم کا علم سب سے افضل ہے۔ اس کے علاوہ جو بھی علم اللہ کی رضا کی خاطر اختیار کیا جائے وہ دین کا شعبہ ہوتا ہے۔ جب کوئی جماعت اس علم کے لئے باہم بیٹھتی ہے۔ تو جیسا کہ گذشتہ سطور میں لکھا جا چکا ہے وہ سکون محسوس کرتی ہے۔ بالخصوص نوعمر اور نوآموز بچوں کو ایک جماعت میں بیٹھ کر پڑھنے سے تسکین ہوتی ہے۔ سبق آسانی سے یاد ہوتا ہے جس کا نتیجہ راحت ہے۔ علم کا بوجھ

بڑا کام ہو جاتا ہے۔ اور نہ صرف علم بلکہ معلم مکتب اور ہم جماعتوں سے محبت پیدا ہو جاتی ہے جہاں یہ محبت پیدا ہو وہاں برکت اور کامیابی کا ہونا لازم ہے جناب ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

یَدُ اللّٰہِ عَلَی الْجَمَاعَۃِ جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔

۲- اخوت۔

مکتب ایک نئی برادری کی بنیاد ڈالتا ہے۔ جس میں محبت کا اتنا قوی اثر ہوتا ہے کہ وہ عمر بھر برقرار رہنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ہم جماعتوں کے ساتھ دائمی انس ہوتا ہے ہم جماعتوں کی ایک مستقل برادری قائم ہو جاتی ہے یہی نہیں بلکہ ایک مکتب کے جس قدر قدیم طلبہ ہوتے ہیں اُن کی بھی ایک جماعت بن جاتی ہے جب دو شخصوں کو اچانک معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی مدرسے کے تعلیم یافتہ ہیں تو ان میں ایک دلی ربط قائم ہو جاتا ہے وہ ایک دوسرے سے مل کر اتنی خوشی محسوس کرتے ہیں گویا انہیں کوئی گم کردہ متاع ہاتھ آ گئی ہے۔

کئی مدرسوں اور کالجوں میں طلبار قدیم کی مجلسیں ہیں یہ انجمنیں ایک وسیع برادری کی ضامن ہوتی ہیں ان کا سال میں عموماً ایک دفعہ اجتماع ہوتا ہے جہاں بچھڑے ہوئے دوست ملتے ہیں اور نہایت ہی پرمسرت ماحول میں ایک دوسرے سے تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔

اس اخوت کی بنا ہمیشہ مدرسہ کا اشتراک ہی نہیں بلکہ بعض اوقات معلم کا نام ایک بھی ہوتا ہے بعض مسلمین کا علم کی تاریخ اور شاگردوں کی زندگی پر نمایاں اثر ہوتا ہے شاگرد ان کے دامن فیض سے وابستہ ہونے کو سرمایہ افتخار سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے استاد کا نام فخر سے لیتے ہیں اور اس کے تمام شاگرد اپنے دوسرے ہم سبق طلبار سے بڑی محبت رکھتے ہیں۔

پچھلے دنوں اخبارات میں ایک اعلان دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں مولانا سید انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے ایک شاگرد نے اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ میں استاذ مکرم کے سب شاگردوں کے حالات مرتب کرنا چاہتا ہوں۔ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے

شاگردوں کا حلقہ دور دراز تک پھیلا ہوا ہے۔ ان کے شاگرد اپنے کو حسینی کہتے ہیں۔ بجا طور پر شرف محسوس کرتے ہیں۔ یہی حال دوسرے بلند پایہ علمار اور اساتذہ کا بھی ہے بلکہ بارہا ان اساتذہ کا علمی اثر شاگردوں کی آئندہ نسلوں میں بھی متوارث ہوجاتا ہے اور اس خاندان کے لوگ اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ہمارے فلاں فلاں بزرگ نے فلاں عالم سے فیض پایا تھا۔

مکتب یا معلّم کی قائم کی ہوئی اخوت نہایت وسیع اور مستحکم ہوتی ہے۔ اور پشتوں تک قائم رہتی ہے۔

۳۔ نظم و ضبط۔

مکتب کی زندگی سراپا انبساط ہوتی ہے۔ طالب علم کے دل میں آہستہ آہستہ نظم و ضبط کی روح گھر کر جاتی ہے وہ نظم و ضبط کی سب جزئیات عمر کے ابتدائی حصہ میں سیکھ لیتا ہے اور زندگی بھر ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ ان جزئیات کا احاطہ بڑا مشکل ہے ان میں بعض درج ذیل ہیں۔

وقت پر آنا نظام الاوقات کی پابندی۔
وقت ضائع نہ کرنا۔
روز کا کام روز کرنا
جماعت میں سکون سے بیٹھنا۔
ساتھیوں کے حقوق کا خیال رکھنا۔
کسی پر زیادتی نہ کرنا۔
معلّم کی اطاعت کرنا۔
بغیر اجازت جماعت سے باہر نہ جانا۔
چھٹی حاصل کئے بغیر مکتب سے غیر حاضر نہ ہونا۔
کھیل کے میدان میں قواعد کا پابند ہونا۔
وقت پر سونا۔

وقت پر جاگنا۔

اعتدال سے سونا۔

۴۔ مکتب میں انسان شائستہ اور نیک اطوار سیکھتا ہے۔ اساتذہ تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کے سلیقہ پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ آداب مکتب کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان میں سے چند ذیل میں درج ہیں۔

اساتذہ کی تعظیم۔ اس تعظیم کا اثر یہ ہوتا ہے کہ استاد کے علاوہ دوسرے بزرگوں کی تعظیم بھی اخلاق کا جزو بن جاتی ہے۔

ادب سے بولنا۔

بدزبانی نہ کرنا۔

صفائی رکھنا۔

سلیقہ کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا۔

کمرہ میں سلیقہ سے چلنا۔ نہ کہ بے طرح بھاگنا۔

بغیر ضرورت نہ کھانسنا نہ تھوکنا نہ ناک صاف کرنا

اپنی پڑھائی میں خیال رکھنا توجہ کو بھٹکنے نہ دینا

کتابوں اور کاپیوں کو صاف ستھرا اور سلیقہ سے رکھنا۔

۵۔ استاد کا اخلاقی اثر۔

وہی علم صحیح علم ہے جو روحانیت کو بلند کرتا ہے اس لئے معلم کے لئے نیک سیرت اور بلند اخلاق ہونا لازمی ہے۔ ورنہ نظام تعلیم میں اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ معلم سے جس روحانی رفعت اور اخلاقی پاکیزگی کی توقع کی جاتی ہے اس کی توقع والدین سے بھی نہیں ہوتی۔ والدین کا دائرۂ اثر گھر کی چار دیواری تک ہوتا ہے معلم پوری ملت پر اثر انداز ہونے کا بیڑا اٹھاتا ہے۔ اس لئے اس کے اخلاق میں بدر کامل کی طرح نورانیت ہونی چاہیے۔ تاکہ وہ سارے عالم کو اپنے پاکیزہ جان افزا اور روح پرور نور سے سیراب کر سکے۔ اسلام نے اخلاق کے ایسے معلم پیدا کئے ہیں جو

بے مثال اور بے سیر حیثیت اور ممتاز شخصیت کے چمکتے ہوئے مینار روشنی قرار دئے جا سکتے ہیں۔ ان کی ہستیاں دُنیا پر ایسے نقوش چھوڑ گئی ہیں کہ اگر وہ کسی اور مذہب میں پیدا ہوتے تو انہیں دیوتا سمجھ کر پوجا جاتا۔ یا انہیں کم از کم پیغمبر سمجھا جاتا۔

اسلامی نقطۂ نگاہ سے معلم میں مندرجہ ذیل اوصاف ضرور ہونے چاہئیں۔

ا۔ خوفِ خدا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ امام اعظم حضرت ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا پاؤں ایک بچے کے پاؤں پر پڑ گیا بچے نے چیخ کر کہا، خدا سے نہیں ڈرتا امام موصوف اتنے متاثر ہوئے کہ انھیں غش آگیا۔

اسلام اپنے متبعین سے اس قسم کے خوفِ خدا کا طالب ہے۔ اور اساتذہ میں یہ صفت بہت ضروری ہے۔

ب۔ شرع کی پابندی

اسلام میں متعدد ایسے علمائے کرام گذرے ہیں کہ ان کے اقوال ہی نہیں بلکہ اعمال بھی شریعت میں سند کا درجہ رکھتے ہیں۔

ج۔ وقار و متانت۔

خلیفہ ہارون الرشید نے امام مالکؒ سے درخواست کی کہ میرے پاس حاضر ہو کر مجھے علم حدیث پڑھایئں گے۔ امام موصوف نے انکار کیا اور فرمایا کہ علم کو پست نہ کرو ورنہ اللہ تعالےٰ تمہیں پست کر دے گا۔

د۔ قربانی۔

اسلام کی آن کی خاطر علمائے کرام نے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ جلیل القدر آئمہ نے اس راہ میں جو شدائد اٹھائے ہیں ان کا ذکر ہی بڑا زہرہ گداز ہے۔

ہ۔ شفقت۔

اُستاد والدین سے بھی بڑھ کر شفیق ہوتا ہے۔ والدین کے دو چار بچے ہوتے ہیں،

لیکن استاد کو سینکڑوں شاگردوں کی نگرانی کرنی ہے۔ اس لئے اس کا قلب وسیع ہوتا ہے۔ وہ شاگردوں سے اپنے بچوں سے بھی بڑھکر محبت رکھتا ہے۔
قدرتی بات ہے کہ ہر صاحب اخلاق دوسرے لوگوں کو بھی نیک اخلاق سے متصف دیکھنا چاہتا ہے۔ معلم کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ طلبہ کی سیرت کو اس حد تک بلند کرے کہ ملت اسلامیہ کو ان پر ناز ہو۔ اسلام میں ایسے معلمین کا شمار نہیں جنہوں نے قوم کے اخلاق پر نہایت نیک اور دیرپا اثر ڈالا ہے۔

۶۔ جسمانی تندرستی۔

ہر مکتب کا ایک مقررہ نظام الاوقات ہوتا ہے نظام الاوقات بناتے وقت طالب علم کی زندگی کے سب شعبوں کو سامنے رکھا جاتا ہے۔ اور جسمانی ریاضت کو بھی خصوصی وقت دیا جاتا ہے۔
پہلے زمانہ میں زندگی کا ڈھب ہی ایسا ہوتا تھا کہ انہیں چونکہ خوب محنت مشقت کرتے روزی پیدا کرنی پڑتی تھی۔ اس لئے ریاضت جسمانی کا الگ شعبہ اکثر نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔ پھر بھی انہیں شمشیر زنی اور شہسواری اور حربی تربیت ضرور سکھائی جاتی تھی۔
ہمارے اسلاف میں سے ایسے علماء گذرے ہیں جو میدانِ جہاد میں سپاہیانہ شان سے نکلتے تھے۔ موجودہ دور میں بھی حضرت سید احمدؒ شہید بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ وغیرہ کی سبق آموز زندگیاں ہمارے سامنے ہیں۔

۷۔ گھریلو زندگی کی تربیت۔

کئی مکتبوں کے ساتھ اقامت گاہیں بھی ہوتی ہیں یہاں طالب علم کو چھوٹے پیمانہ پر گھریلو زندگی کی تربیت حاصل ہوتی ہے۔ ضرورت بھر کا مختصر سامان سنبھالنے خورد و نوش کا انتظام کرنے پوشاک اور اس کی دھلائی اور حفاظت وغیرہ کی ذمہ داری اسے زندگی میں پہلی بار تربیت ملتی ہے اور وہ سیکھتا ہے کہ اپنے پاؤں پر کیسے کھڑا ہو۔

اہم سوالات

۱۔ اسلام سے پہلے زمانہ کو زمانہ جاہلیت کیوں کہتے ہیں واضح کریں۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تعلیم اور مکتب کی صورت کیا تھی۔ مثالوں سے واضح کریں۔

۳۔ اسلامی نظام تعلیم کے سلسلے میں مختلف تاریخی زمانوں کا جائزہ پیش کیجیے۔
ان کی خصوصیات اور خوبیوں کا شمار کر کے ثابت کیجیے کہ وہ بہترین نظام تعلیم تھا۔

۴۔ طالب علم اور معلم کے فرائض کی تفصیل پیش کریں۔

۵۔ اسلامی معاشرے میں مسجد کی ضرورت اور اہمیت واضح کریں، اور نظام تعلیم مسجد کا خصوصی مقام ثابت کریں۔

۶۔ مکتب یا درس گاہ کی مختصر تاریخ درج کر کے بتائیں کہ یہ کون کون سے فرائض انجام دیتا ہے۔

باب (۲۱)

معاشرہ

معاشرہ کا لفظ عشیرہ سے نکلا ہے۔ عشیرہ کے معنی خاندان اور برادری کے لوگ ہیں لیکن معاشرہ لغت میں وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس سے اہل محلہ یا اہلِ مُلک اور اہلِ وطن مُراد ہے یا وہ لوگ جنہیں کوئی جغرافیائی تقسیم باہم متحد کر دے۔

اگر اسلامی معاشرہ کا لفظ استعمال کیا جائے تو معنوں میں اور بھی وسعت آ جاتی ہے۔ اور اس سے مُراد وہ جغرافیائی مُلک جس کے باشندے کسی خاص مقصد کو اپنے سامنے رکھتے ہوئے باہم متحد اور ہم وطن بن گئے ہوں اس کی مثال پاکستان کا ملک بھی ہو سکتا ہے جو ایک نظریاتی مُلک ہے اور جس کی بنیاد دین ملّت اور اسلامی عقاید و اعمال پر قائم کی گئی ہے۔ بلکہ اسی وقت دُنیا میں یہی ایک مُلک ہے جو اسلامی معاشرہ کے قیام کے مقصد کو سامنے رکھ کر بنایا گیا ہے۔

صرف اجتماعی زندگی گزارنا ہی معاشرے کا تقاضا نہیں کیونکہ ہر زندگی گذارنا ایک جیسا نہیں ہوتا اگر بعض جانوروں میں اکٹھے ہو کر زندگی بسر کرنے کا دستور ہے تو یہ ایک جبلی تقاضا ہے اسے معاشرہ کا نام نہیں دیا جا سکتا بلکہ ایک ریوڑ یا گلہ کا نام دیا جا سکتا ہے۔

معاشرہ اس اجتماعی زندگی کا نام ہے جو انسانوں میں کسی خاص مقصد اور نصب العین کے ماتحت متحدہ صورت میں تشکیل پائے۔

اہمیت۔

انسان مدنی الطبع ہے۔ اور یہ اس کا فطری تقاضہ ہے۔ اور اسلام معاشرہ کی اہمیت پر بہت زور دیتا ہے۔ اس سے پہلے نماز باجماعت کا ذکر کیا جا چکا ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اجتماعی زندگی اسلام میں کس قدر پسندیدہ اور تاکید شدہ ہے۔ اور اس پر کس قدر زور دیا جاتا ہے۔

رہبانیت اور ترک دنیا اور دنیا کی بے رغبتی کا یہ مطلب ہے کہ بنی نوع انسان سے لاتعلقی کا اظہار کیا جائے اور دنیا سے تعلق کاٹ کر اپنی جائز خواہشات کو روکا جائے یہ طرز عمل اسلام کی رو سے ممنوع ہے اور اس کی زندگی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے افسوس کیا ہے۔ بلکہ باہم مل جل کر ایک دوسرے سے تعاون اور اشتراک کی روح قائم کرنے کی تاکید کی ہے۔ اس میں یہ حکمت ہے۔ کہ انسان اپنی صلاحیتوں کو صرف اجتماعی زندگی میں ہی بخوبی استعمال کر سکتا ہے۔ اگر وہ الگ تھلگ ہو کر رہے تو اس کے لئے زندہ درگور ہونا اس سے بہتر ہے۔ اس غیر فطری زندگی میں فرد معاشرہ کے لئے عضو معطل بن جاتا ہے۔ اس کی زندگی اور موت کے بعد کی اصل زندگی دونوں کے لئے عذاب ہے۔

جو چیز انسان کی طبعی خواہشات اور فطری حاجتوں میں درکار ہو اس کی اہمیت پر زیادہ بحث نہیں کی جا سکتی بلکہ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ کا مقصد کیا ہے۔

مقصد۔

یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ معاشرہ ایک بامقصد اجتماعی زندگی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ مقصد کیا ہے جس کی خاطر یہ اجتماعی معاشرہ تشکیل کیا گیا ہے۔

۱۔ عبادت الٰہی۔

اللہ تعالےٰ نے انسان کے دنیا میں بھیجنے کا یہ مقصد بیان فرمایا۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ۔ یعنی ہم نے انسان کو صرف اس لئے پیدا کیا اور جنوں کو اس لئے بنایا ہے کہ اللہ کی عبادت کریں۔

انسان کی زندگی کا مقصد جب عبادت قرار پایا تو اب غور کیا جائے گا کہ عبادت کیا ہے۔
اور کس طرح کی جاتی ہے۔

تخلیقِ آدمؑ کے بعد جب آدم علیہ السلام کو جنت میں بسایا گیا اور جنت سے نکالا گیا تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اب تم دنیا میں جاؤ۔ تم بھی اور تمہاری سب اولاد بھی اور جب بھی تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے تو جو اسے قبول کریگا وہ ان باغوں میں دوبارہ آسکے گا۔ جن سے تم کو نکالا گیا اور نافرمانوں کے لئے میرا عذاب بڑا سخت ہے۔

تمام مخلوق پر انسان کی فضیلت اسی وجہ سے ہے کہ انسان دنیا میں بہ حیثیت اور اعلیٰ مقام پر فائز ہے اور زمین پر خلیفہ بنایا گیا ہے اور چونکہ اس کا مقصد اللہ کی ہدایت کی تلاش اور اس کی رضا مندی کی طلب گار ہے اور یہ فریضہ کسی اور مخلوق کے ذمے نہیں لگایا گیا تو اس سے ثابت ہوا کہ انسان کے لئے اللہ کی رضا کی طلب سب سے بڑی عبادت ہے جو زندگی کا مقصد ہے اور باقی مخلوق انسان کے لئے ہے کیونکہ وہ ان تمام مخلوقات سے افضل ہے جو اس کے علاوہ ہیں اور اس سے اعلیٰ صرف ذاتِ باری تعالیٰ ہے جس کی عبادت اور رضا جوئی انسانی زندگی کا مقصد ہے اللہ اور رسولؐ نے جو احکامات اپنی امت کو دئے ہیں ان کی رو سے فرد اور معاشرہ کی حیثیت ثانوی درجہ رکھتی ہے۔ اور فرد یا معاشرہ میں سے کسی کو زیادہ اہمیت نہیں اور نہ ہی کسی سے اہمیت کم ہوتی ہے بلکہ افضل حیثیت فرائض کی بجاآوری ہے۔

اسلامی معاشرہ کے خاص اوصاف مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) استحکام (۲) عوامیت

(۳) سادگی۔ (۴) وضع داری۔ (۵) ہمدردی۔

ذیل میں فرداً فرداً ہر ایک کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

۱۔ استحکام۔

معاشرہ وہی مفید ہو سکتا ہے۔ جو خوب پختہ ہو اور اس کے افراد میں قریبی

تعلق ہو ایک دوسرے کے نفع نقصان اور دکھ سکھ میں شریک ہوں۔ کوئی شخص کسی کی ویرانی میں اپنی آبادی کی تلاش نہ کرے۔ معاشرہ کے سب افراد کے ذہن میں یہ عقیدہ جاگزیں ہو کہ ایک کا بھلا دوسرے کا بھلا ہے اور ایک کا نقصان دوسرے کا نقصان ہے۔

معاشرہ کے استحکام کے لئے دو شرطیں لازمی ہیں۔

وحدتِ فکر۔

وحدتِ عمل۔

وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل کے درمیان پوری ہم آہنگی ہونی چاہیئے جس معاشرہ میں یہ صفت نہ ہو وہ پراگندگی اور انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔

جو وحدتِ فکر اسلام نے پیش کیا ہے وہ اور کوئی مذہب پیش نہیں کر سکتا۔ اس فکری وحدت کی بنیاد ایمان ہے۔ اللہ پر ایمان فرشتوں پر ایمان۔ کتب سماوی پر ایمان۔ رسولوں پر ایمان۔ قیامت کے دن پر ایمان۔ موت کے بعد دوبارہ زندہ کئے جانے پر ایمان اور تقدیر خداوندی پر ایمان یہ عقائد ہر مسلمان کے دل میں راسخ ہوتے ہیں ان ہی کی بنیاد پر ہر فرد اپنا ذہنی ساز و سامان تیار کرتا ہے چونکہ بنیاد ایک ہے اس لئے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں فروعی اور ادنیٰ درجے کے اختلاف کی صورت میں کوئی ایسا نقصان نہیں اختلاف اگر نیک نیتی سے ہو اور افہام و تفہیم مطلوب ہو تو اس کے رفع ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ لیکن اگر اختلاف زیادہ ہو جائے اور اس سے اُمتِ مُسلمہ میں شر فساد کا ڈر ہو تو تعلیماتِ اسلام موجود ہیں۔ اور نیک نیت اور اصلاح کرانے والوں کی کمی نہیں۔

مسلمانوں کا خدا ایک قبلہ ایک کتاب ایک رسول ایک اور شریعت ایک ہے جب وحدتِ فکر کی اتنی شقیں ایک ہیں تو فکر کی دوئی اور انتشار کا پیدا ہونا محال ہے اسی عقیدہ میں روح اور مادہ کا حسین امتزاج موجود ہے۔

وحدتِ فکر کے بعد وحدتِ عمل کا درجہ آتا ہے وحدتِ عمل کے سب سے بڑے عوامل ارکانِ اسلام ہیں جو اعلان کلمہ شہادت. نماز روزہ حج اور زکوٰۃ پر مشتمل ہیں ان کے اصولی احکام کتاب اللہ اور سنّت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں صراحتاً موجود ہیں۔ اس لئے اس میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں البتہ بعض لوگ ان احکام کی خلاف ورزی کر کے معاشرہ میں رخنہ انداز ہونے کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یہ اللہ کی نگاہ میں مجرم ہیں افسوس کہ اس مُلک پاکستان میں ایسے ایسے مدعیانِ علم مجتہد پیدا ہو رہے ہیں جو دورِ غلامی کی صحیح یادگار ہیں، جن کے اذہان پر بقول علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ فرنگیوں کا فسوں غالب ہے، وہ معاملات کو فرنگی عینک سے دیکھنے کے عادی ہیں ان کے دماغوں پر فرنگیوں نے ایسا جادو کر دیا ہے کہ ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا نظر آتا ہے۔ جو اپنی روایات اور بزرگان سلف پر کیچڑ اچھالتے ہیں اور نہایت دیدہ دلیری سے اور انتہائی ڈھٹائی سے اہلِ اسلام کے اب تک کے طرزِ عمل کو غلط اور پس ماندہ اور جمود زدہ کا نام دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اسلام کے اصول مادی ترقی سے مانع ہیں یہ لوگ دشمنانِ اسلام اور بدخواہان عالم اسلام کے کارندے ہیں یہ ان سے بڑی بڑی خطیر رقمیں لیتے ہیں اور اہل اسلام کے درمیان ایسے ایسے فتنے پیدا کرتے ہیں جو گذشتہ زمانوں میں مسیلمہ کذاب اسود عنسی اور عبداللہ بن سبا نے پیدا کئے تھے۔ جو اسلامی تاریخ کی روح سے قطعی طور پر نابلد ہیں۔

اسلام اپنے متبعین کو فکر و عمل کو بیڑیاں نہیں پہناتا اصول کی پابندی ضرور ہے اور فروع آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن اس آزادی کو بھی بے لگام نہیں چھوڑتا اختلاف فروغ میں بے شک ہو سکتا ہے لیکن اختلاف کرنے والے کے لئے بھی چند قیود اور اصول مقرر ہیں۔ فروغ کا اختلاف سطحی نوعیت کا ہو تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن یہ کہنا کہ اب تک جس طرح اسلام کے متبعین کا طرزِ عمل رہا ہے وہ غلط ہے اور ہم جو سوچتے ہیں وہ ٹھیک ہے بزرگوں

اور ائمہ اسلام کے ساتھ سخت ناانصافی ہے۔ ایسے ہی مدعیانِ قیادت
میں ایک گروہ ایسا ہے جو سنتِ نبویؐ کی اہمیت کو بھی تسلیم نہیں کرتا اور مسائل
میں اپنے اختراع کیے ہوئے اور بے بنیاد نتائج پر معاشرہ کو چلانا چاہتا ہے۔
بہرحال چونکہ ایسے لوگ شیطان کے ایجنٹ اور بدخواہانِ اسلام کے کارندے ہیں جن کے
ذہن پر مغرب کی ابلیسیت سوار ہے۔ اور جو دورِ غلامی کی منحوس یادگاریں ہیں جن کے
سامنے مغربی مصنفین کی تحریریں اور کھوکھلے دعاوی ہیں۔ جس طرح
[illegible] شکنی کا انسداد ضروری ہے اسی طرح معاشرہ کی آداب شکنی کا انسداد بھی لازمی ہے
[illegible] معاشرہ منظم متحد اور مضبوط ہو تو اسلام کے قواعد کی خلاف ورزی کی جرأت کرنا
[illegible] معاشرہ میں وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل نہ ہو تو اس میں اتحاد اور تنظیم پیدا
[illegible] مشکل کام ہے۔

۲۔ عوامیت۔

اسلامی معاشرہ کی عملی شکل ایسی ہونی چاہئے کہ غربا اور مساکین اس میں داخل ہونے
میں جھجک محسوس نہ کریں۔

جس معاشرہ میں امراء اور رئیس لوگوں کا جداگانہ طبقہ قائم ہو جاتے اور عوام
کے لیے اس میں باریابی مشکل ہو اس میں بہت جلد کمزوری اور ضعف پیدا ہو جاتا
ہے۔ ایک دفعہ مکہ کے ایک رئیس نے حضرت عمرؓ کی دعوت کی کھانا چنا گیا تو نوکر
الگ کھڑے ہو گئے۔ حضرت فاروق اعظمؓ بہت ناراض ہوئے اور فرمایا اللہ تعالیٰ ان
لوگوں کو سمجھے جو نوکروں کو ساتھ بٹھانے میں عار جانتے ہیں۔ حضرت امیر معاویہؓ کا
طریقہ تھا کہ سائلوں کو اپنے ساتھ دسترخوان پر بٹھاتے اور ان کی شکایات سنتے۔
اگر یہ طریق نہ بھی ہو تو بھی اسلامی معاشرہ میں کم از کم یہ تو ہو کہ ہر غریب آدمی یہ توقع
رکھے کہ اسلامی معاشرہ میں میرا بھی حصہ ہے اور ہر مجلس کو غریب آدمی بھی قومی
اور اپنی مجلس سمجھے۔ غرض اسلامی معاشرہ میں عوام اور غریب طبقے سے لامحالہ
مساوی سلوک روا رکھا جائے اور امیر غریب کی تمیز کو خیرباد کہہ دیا جائے۔

عطا کرتے ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے گفتگو اور لباس وغیرہ کے بارے میں اسلام نے خاص ہدایات دی ہیں جن سے کوئی پابندیاں تو عائد نہیں ہوتیں لیکن زندگی میں ایک ایسا اسلوب پیدا ہو جاتا ہے کہ ہر دیکھنے والا شخص مسلمان کو پہچان جاتا ہے۔

ہر قوم کے معاشرتی خصائص ہوتے ہیں۔ جن سے قومی خودی اور خودداری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ ملی حمیت زندہ رہتی ہے اور احساس قومیت مضبوط رہتا ہے۔

قومی خودداری اور وضع داری کا ایک اور عظیم فائدہ یہ ہے کہ ماضی سے تسلسل برقرار رہتا ہے۔ اسلام کا نہایت شاندار ماضی ہے اسلام نے معاشرت اور ثقافت میں ساری دنیا کی رہنمائی کی ہے۔ ہمیں اس ماضی سے لاتعلق نہیں ہو جانا چاہئے اگر ہم نے اپنے پاکیزہ اور پُرشکوہ ماضی سے رشتہ توڑ لیا تو اپنا مقام ہمیشہ کے لئے گم کر بیٹھیں گے۔

۵۔ ہمدردی۔

ہر مسلمان دوسرے مسلمان کو بھائی سمجھتا ہے۔ اور اس سے ہمدردانہ میل ملاپ رکھتا ہے۔ متبادل روابط اور منافقانہ سلوک قوم کی زندگی کو گھن کی طرح کھا جاتے ہیں۔ مسلمانوں کو ایک دوسرے سے ہمدردانہ تعاون رکھنا چاہئے۔ مشکل میں ایک دوسرے کے کام آئیں اور وقت پر ایثار کا ثبوت دیں۔

۶۔ بے کار مشاغل سے اجتناب۔

ہر معاشرہ میں ایک بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے افراد فراغت کے لمحات کو کس طرح بسر کریں۔ اس لئے لوگوں نے تفریح کے مختلف مشاغل سوچ رکھے ہیں۔ اسلام تفریح پر پابندیاں عاید نہیں کرتا لیکن ایسے مشاغل سے منع کرتا ہے جن میں نہ دین ہی ہاتھ آئے اور نہ دنیا کا بھی کوئی فائدہ نہ ہو جوئے کی تمام اقسام اور ایسے مشاغل جن میں ہار جیت ہو

قطعی ممنوع ہیں فرصت کے مشاغل ایسے ہونا چاہئیں کہ طبیعت کو فرحت بھی ہو تھکن اور سستی دور ہو۔ مناسب ورزش بدنی بھی ہو جائے اور انفرادی یا قومی لحاظ سے بھی فائدہ ہو۔

اہم سوالات

۱۔ معاشرہ سے کیا مراد ہے۔ اس کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

۲۔ اسلامی معاشرے کی نمایاں خصوصیات بیان کریں۔

۳۔ اسلامی معاشرہ کے پیش نظر اس کا ماضی سے الگ ہو جانا کیوں نقصان دہ ہے۔ واضح کریں۔

۴۔ اسلامی معاشرے کو غلط معنی پہنا کر جو لوگ مسلمانوں کو گمراہ کرتے ہیں ان کی معلومات کے ماخذ بیان کریں۔ اور یہ بھی واضح کریں کہ ان کے نظریے کو قبول کرنے سے کیا نقصان ہو سکتا ہے۔

باب (۲۲)

اَقارِبْ

اہمیت:۔

رشتہ داری فطری چیز ہے

اسلام ہمیں سچے مسلمانوں سے دلی تعلق رکھنے کا حکم دیتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی فطری محبت کو بھی ملحوظ رکھتا ہے۔ اور قربت کے لحاظ سے درجہ بدرجہ حقوق قائم کرتا ہے اقارب یعنی رشتہ داروں کے حقوق دوسروں پر فائق ہیں۔

رشتہ داروں سے انسان کو طبعی محبت ہوتی ہے۔ اگر کبھی ناراضگی پیدا ہو بھی جائے تو اس کو دور کرنے کا ہمیشہ قوی امکان موجود ہوتا ہے اس لئے رشتہ داروں کے ساتھ جو معاشرت قائم ہو وہ ہمیشہ مضبوط رہتی ہے۔

رشتہ داری زندگی کی قوت ہے۔

جس جانثاری کا ثبوت رشتہ دار دیتے ہیں اس کی توقع اوروں سے مشکل ہے، مستحکم برادری والے انسان کا دل مضبوط رہتا ہے اسے علم ہوتا ہے کہ مصیبت کے وقت رشتہ دار ہر ممکن قربانی کریں گے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اپنے اور عم زاد کے دم سے اکیلا آدمی کثیر ہوتا ہے۔ آئے دن کی زندگی میں رشتہ دار اس کا ہاتھ بٹاتے ہیں اور اس کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں رشتہ داروں کی موجودگی میں پریشانیاں حتی الوسع قریب نہیں آتیں۔ انسان کے

ذہنی اور بدنی قوی مضبوط رہتے ہیں اور عمر میں اضافہ ہوتا ہے۔ فطرت کے نباض اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قرابت نوازی عمر کو بڑھاتی ہے۔

رشتہ داری سے تعمیری منصوبے کامیاب ہوتے ہیں۔

رشتہ داری ایک ایسی عظیم قوت ہے جس سے بڑے بڑے کام لیئے جاسکتے ہیں۔ رشتہ داروں کے سامنے جب کوئی فلاح و بہبود کا منصوبہ ہوتا ہے تو وہ اسے ایثار اور تن دہی کے ساتھ سرانجام دیتے ہیں۔ خاندان کا سربراہ اس منصوبہ کو ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ رقم کی ضرورت ہو تو سب اپنا اپنا حصہ خوشی سے ادا کرتے ہیں اگر چند آدمی ادا نہ کر سکیں تو منصوبہ ملتوی نہیں ہوتا بلکہ صاحب مقدور رشتہ داروں کا حصہ ادا کر دیتے ہیں۔ اور حساب بعد میں بیباق ہو جاتا ہے چونکہ ہر شخص کو صرف اپنی ہی نہیں دوسرے رشتہ داروں کی بھلائی بھی منظور ہوتی ہے۔ اس لیئے وہ دل لگا کر کام کرتا ہے۔ مکان بنانے ہوں کنوئیں کھودنے ہوں کھیت آباد کرنے ہوں۔ جہاں بھی رشتہ داروں کا تعاون ہو وہاں توقع سے بڑھکر کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

قرابت نوازی حسن خلق اور خوش گوار ہمسائیگی سے بستیاں آباد ہوتی ہیں اور عمریں دراز ہوتی ہیں جن نیکی کا سب سے جلد ثواب ملتا ہے وہ صلہ رحم (قرابت) ہے۔ حتیٰ کہ اس خاندان والے فاجر بھی ہوں تو ان کے اموال ترقی پذیر ہوتے ہیں اور ان کی مقدار بڑھتی ہے اور کوئی خاندان ایسا نہیں کہ اس کے اندر اتحاد ہو اور اس کو احتیاج آئے۔

قرابت رحمت خداوندی کا مظہر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے رشتہ قرابت میں اپنی رحمت اور برکت ودلیعت کر رکھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی برکتوں کی ایک سبیل یہ مقدس رشتہ ہے اللہ تعالیٰ ان بندوں سے خوش ہوتا ہے جو رشتہ داری کو ٹوٹنے نہیں دیتے ان پر رحمتوں کی بارش

کرتا ہے ان کی زندگی کے رخنوں کو بھرتا ہے اور ٹوٹے ہوئے دل جوڑ دیتا ہے۔ جناب ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

رحم (قرابت کی اصل رحمٰن ہے جس نے اسے جوڑا اللہ تعالےٰ اس کی شکستگی مٹاتا ہے۔ جس نے اُسے شکستہ کیا اللہ اسے شکستہ حال کر دیتا ہے

جو آدمی چاہتا ہے اُس کی عمر بڑھے رزق کشادہ ہو بری موت سے بچے اور اس کی دُعا قبول ہو اُسے چاہیئے کہ رشتہ قرابت کو جوڑے

رشتۂ قرابت کو سالم رکھنے کی تاکید۔

سورہ الرعد میں اللہ تعالےٰ نے عقلمندوں کی ایک صفت یہ بتائی ہے کہ جس چیز کو اللہ نے ملانے کا حکم دیا ہے اسے ملاتے ہیں یعنی قربت کو توڑتے نہیں بلکہ سالم اور قائم رکھتے ہیں،

اس بارے میں ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات درج ذیل ہیں

جو آدمی اللہ تعالےٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیئے کہ رشتۂ قرابت کو پیوستہ رکھے۔

اللہ تعالےٰ کے نزدیک توحید کے بعد محبوب ترین عمل رشتہ قرابت کا جوڑنا ہے۔

قریبی رشتہ داری تو اکثر پیش نظر رکھی جاتی ہے لیکن دور کی رشتہ داری کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ حضورؐ نے ان کے بارے میں بھی تاکید فرمائی کہ اپنے احباب یاد رکھو تاکہ تمہاری قرابت استوار رہے۔

بدخواہ رشتہ داروں سے حُسنِ سلوک۔

بارہا ایسے رشتہ داروں سے پالا پڑتا ہے جن کے دل محبت سے خالی ہوتے ہیں۔ ان سے سوائے کینہ کے اور کچھ ظاہر نہیں ہوتا۔ ایسے رشتہ دار بے شک پریشانی اور ملال کا باعث ہوتے ہیں لیکن یہی لوگ اللہ تعالےٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کا موقعہ بھی مہیا کرتے ہیں۔ ان کی کینہ توزی اور شرانگیزی کو برداشت کر کے اُن سے حُسنِ سلوک روا رکھا جائے تو اس کے عوض اجرِ عظیم ملتا ہے

احادیث میں ایسے رشتہ داروں سے تعلقات برقرار رکھنے کی بہت تاکید ہے۔
ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ میرے کچھ رشتہ دار ہیں میں ان سے تعلق قائم رکھنا چاہتا ہوں اور وہ دغاباز ہیں ان سے بھلائی کرتا ہوں اور وہ برائی کرتے ہیں۔ میں ان سے حلم کرتا ہوں اور وہ سختی کرتے ہیں حضورؐ نے فرمایا کہ اگر تم ویسے ہی ہو جیسا کہ بتا رہے ہو تو جب تک اس حال پر رہو گے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ تمہاری امداد پر مامور رہے گا۔

قرابت ختم کرنے کی سزا۔

جو آدمی قرابت ختم کرتا ہے وہ اللہ کے غضب کا سزاوار ہے۔ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
قرابت ختم کرنے والے کا عمل قبول نہیں ہوگا۔
قاطع قرابت جنّت میں داخل نہ ہوگا۔
ایک روز آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجلس میں فرمایا تم میں اس وقت جو قاطع قرابت ہے وہ اُٹھ جائے۔ ایک نوجوان اُٹھ کر چلا گیا اس کی اپنی خالہ سے کچھ بدمزگی تھی اس کے پاس حاضر ہوا اور مصالحت کر کے واپس آیا حضور نے فرمایا کہ جن لوگوں میں کوئی قاطع قرابت ہو ان پر رحمت نازل نہیں ہوتی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت دار

جناب ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اسلام کی دعوت کا آغاز فرمایا تو آپ کو اپنے خاندان کے سامنے خصوصیت سے تبلیغ کرنے کا حکم ہوا اگرچہ آپ کا چچا آپ کا آخر دم تک دشمن رہا۔ لیکن دوسرے چچاؤں اور ان کی اولاد نے آپ کی حفاظت میں اپنی جانیں تک وقف کر دیں، حالانکہ اس وقت تک سب افراد ایمان نہ لاتے تھے اور آپ کے چچا حضرت عباس بھی مسلمان نہ ہوئے تھے شعب ابی طالب میں تین سال تک آپ محصور رہے۔ اور آپ کے ہمراہ تمام بنو ہاشم بھی اس محصوریت میں آپ کے ہمراہ تھے انہوں نے آپ کے ہمراہ بڑی تکلیفیں اٹھائیں اور عظیم مالی

ایثار کئے۔ جناب ابوطالب نے اپنی ساری تجارت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حفاظت کی فکر میں ضائع جانے دی۔ اللہ تعالےٰ نے ان قربانیوں کو قبول فرمایا اور مال غنیمت میں آپؐ نے مسلم قرابت داروں کا حصہ مقرر کیا۔

حضورؐ نے اپنی امت کی کس قدر عظیم خدمت انجام دی لیکن کسی سے کوئی اجر سوائے اس کے طلب نہیں کیا' کہ میرے قرابت داروں سے محبت رکھنا اس خواہش کا اظہار وحی الٰہی سے فرمایا۔

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى

اے نبیؐ کہہ دیجیئے کہ میں اس تبلیغ اسلام کے عوض سوائے قرابت داری کی محبت کے اور کوئی اجر نہیں مانگتا۔

امت کے عوام کو اس آیت کے ذریعے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان والوں اور بیبیوں کی محبت پر زور دیا گیا ہے اور اس آیت سے حب رسولؐ اور حب آل رسولؐ کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

یہی آپ کے قرابت دار تھے جنہوں نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عدیم المثال محبت اور قربانی کا ثبوت دیا اللہ تعالےٰ نے ان میں سے ایمان لانے والوں کی محبت کو اہل اسلام کے لئے جزو ایمان قرار دیا۔

حقوق۔

سب رشتہ دار حسن سلوک کے مستحق ہیں خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم لیکن سب کے حقوق مساوی نہیں جو حقوق مسلم رشتہ داروں کے ہیں وہ غیر مسلموں کے نہیں ہو سکتے۔ غیر مسلم رشتہ داروں کو دلی رفیق نہیں بنایا جا سکتا۔ لیکن اگر کوئی مشکل پیش آ جائے تو حسب مقدور امداد کی جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار اپنے غیر مسلم رشتہ داروں کے بارے میں فرمایا کہ فلاں لوگ میرے قلبی رفیق نہیں میرا قلبی رفیق اللہ ہے یا نیک مسلمان۔ البتہ ان غیر مسلم اقربا سے میرا خون کا رشتہ ہے میں اسے بھلائی سے تازہ رکھوں گا۔

مسلم رشتہ داروں میں فرق مراتب ۔ مسلم رشتہ داروں کے حقوق میں بھی فرق ہے جس کا

تعلق زیادہ قریبی ہے وہ حسن سلوک کا زیادہ حقدار ہے۔
ایک دفعہ ایک صحابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ میں کس سے بھلائی کروں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنی ماں باپ سے اور اس کے بعد درجہ بدرجہ اور رشتہ داروں سے۔

وسعت۔

رشتہ داروں کے حقوق نہایت وسیع ہیں، ان کا شمار ناممکن ہے، قرآن حکیم میں ارشاد ہے۔
وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۔ اور چاہے وہ خود فاقے سے ہوں۔ وہ انہیں (یعنی دوسرے عزیزوں وغیرہ کو) اپنے پر ترجیح دیتے ہیں۔
یہ آیت اگرچہ انصار کے بارے میں ہے کہ انہوں نے مہاجرین کے ساتھ کیسے ایثار کی روش اختیار کی لیکن اس سے ہمارے سامنے اخلاق کا ایک عام معیار بھی قائم ہو جاتا ہے۔ ہمیں رشتہ داروں کے ساتھ حتی الوسع انتہائی قربانی کا سلوک کرنا چاہئے اور ان کی ہر ضرورت کو خواہ مادی ہو یا روحانی حتی الامکان پورا کیا جانا چاہئے۔ اگر وہ کسی رنج یا پریشانی میں مبتلا ہوں تو ان کی دستگیری کی جائے اگر پس ماندہ ہوں تو انہیں ترقی کی راہ پر چلایا جائے کوئی آدمی ان کی جان و آبرو یا عزت پر حملہ آور ہو تو ان کی حفاظت میں جان پر کھیل جانا چاہئے۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔
تم میں بہترین آدمی وہ نیکوکار ہے جو اپنے خاندان کی مدافعت کرتا ہے۔

مالی مدد۔

قریب رشتہ داروں کی مالی مدد واجب ہوتی ہے۔ والدین اولاد، دادا اور پوتے کا نفقہ کا لازمی ہے۔ خواہ وہ مسلم ہوں غیر مسلم۔۔ ان کے بعد اقارب آتے ہیں ان کے نفقہ کے واجب ہونے کے لئے دین اسلام ضروری ہے۔ یعنی اگر وہ مسلمان ہوں تو واجب ہے ورنہ ضروری نہیں۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں ایک غریب بچہ تھا

اس کے بچیرے بھائی اسے خرچ نہیں دیتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے انہیں قید میں ڈال دیا۔ ایک دفعہ ایک یتیم کا سر پرست حضرت عمرؓ کے پاس حاضر ہوا آپ نے اسے یتیم پر خرچ کرنے کا حکم دیا۔ اور فرمایا کہ اگر مجھے اس کا کوئی ایسا رشتہ دار ملتا جس سے اس کا بعید ترین تعلق ہو تو پھر بھی میں اس کا نفقہ لازم قرار دیتا۔

رشتہ داروں پر خرچ کرنے کا دوہرا ثواب ملتا ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ رشتہ دار پر مالی خرچ کرنے کا دوہرا اجر ہے۔ ایک تو صدقہ کا دوسرے رشتہ داری کا۔

ایک صحابی حضرت ابو طلحہؓ نے جناب پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ میری فلاں جائیداد اللہ کے نام پر وقف ہے آپؐ اسے جہاں چاہیں خرچ کریں۔ حضورؐ نے فرمایا یہ بہت کثیر ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ اسے اقرباکو دے دو حضرت ابو طلحہؓ نے ایسا ہی کیا۔

روحانی مدد۔

رشتہ داروں کو نیکی کی تبلیغ کی جائے۔ برائی سے روکا جائے اور خدمت دین کی طرف مائل کیا جائے اگر وہ گناہ میں گھر جائیں یعنی شیطانی ثقافت اور غیر فطری ثقافت اور تہذیب نو کے پھندے میں گرفتار رہیں تو اس فعل سے بچنے میں ان کی مدد کی جائے اور مادی ماحول اور غیر فطری اسلامی ماحول کے غیر صحت مند اثرات سے انہیں نجات دلائی جائے۔

اقربا پروری کی حد۔

اقربا پروری نہایت قابل تعریف ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب کہ آدمی رشتہ داروں کی خاطر جائز و ناجائز کی تمیز ہی اٹھا دے اور ہر نا جائز اور زیادتی اور عدوان میں ان کی مدد کرے قرآن پاک میں ہے۔

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ

یعنی تعاون کرو نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں اور نہ تعاون کرو گناہ اور زیادتی کے

کے کاموں میں۔

اس کے علاوہ یہ بھی فرمایا اِعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى تم عدل اختیار کرو۔ اگرچہ تمہارے کسی قریبی کے خلاف جائے۔

اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ مناصب اور عہدوں کی تقسیم یا کسی اسامی پر اپنا ہی تقرر کیا جائے اگرچہ اس پر دوسرے قابل اور اہل لوگوں کا حق ہو۔ یہ سب تعصب کی باتیں ہیں جن کی اسلام میں سخت مخالفت ہے۔ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے پوچھا کہ کیا اپنے خاندان سے محبت رکھنا تعصب میں داخل ہے۔ حضورؐ نے فرمایا نہیں، تعصب تو یہ ہے کہ تو اپنے خاندان کی بے انصافی میں مدد کرے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ جو لوگ برادری اور رشتہ داری اور اپنے مال و منال وغیرہ سے اتنی محبت رکھتا ہے کہ باقیوں پر ترجیح دیتا ہے اور دینی امور کی پروا نہیں کرتا اسے دردناک عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔

رشتہ داری اور خاندان سے اللہ کا مقصود یہ ہے کہ ربط و ضبط اور محبت کا وسیلہ ہو نہ کہ ایک دوسرے کے خلاف گروہ بندی کی جائے اور پارٹی بازی یا دھڑے بندی کی جائے۔ جو ملت اسلامیہ کے اجتماعی مفادات کے لئے منافی ہے۔ اسلام میں قبیلہ یا خاندان پر فخر کرنے کی اجازت نہیں سورۃ الحجرات میں ارشاد ہوتا ہے۔ میں نے تمہیں ذاتوں اور قبیلوں میں اس لئے تقسیم کیا ہے کہ تمہیں ایک دوسرے کی پہچان ہو۔ اللہ کے ہاں سب سے زیادہ عزت اور وقار والا وہ شخص ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

باب (۲۴)

ہمسایہ

مفہوم - ہمسائگی کی حد اپنے گھر سے ہر طرف چالیس گھر تک ہے۔ سورۃ النساء سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دائرے میں اپنے بیگانے اور مسلم غیر مسلم سب شامل ہیں۔

مراتب - ہمسائگی کے مراتب میں قرابت کے لحاظ سے فرق ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کافر ہمسایہ کا ایک حق مسلمان کے دو اور قرابت دار کے تین حقوق ہیں، اگر یہ تفریق نہ ہو تو پھر جس کا گھر زیادہ قریب ہو اس کا حق اسی قدر زیادہ ہوتا ہے حضرت عائشہؓ نے ایک دفعہ آپؐ سے دریافت کیا کہ میرے دو پڑوسی ہیں، میں اگر تحفہ بھیجنا چاہتا ہوں تو کس کو بھیجوں فرمایا کہ جس کا گھر زیادہ قریب ہو۔

اہمیت - پڑوسی کی اہمیت اخلاقی نقطۂ نگاہ سے نہیں بلکہ معاشرتی ضروریات کے پیش نظر بھی واضح ہوتی ہے۔ ہمسایہ کے ساتھ ہمدردانہ راہ و رسم ناگزیر ہے وہ ہر وقت کا شریک رنج و راحت ہوتا ہے۔ اور اگر بالفرض ایسا نہ ہو تو عین ممکن ہے کہ کسی وقت شر یا مصیبت کا باعث بن جائے۔ نفع یا نقصان ان دونوں میں کسی ایک چیز کا احتمال ہمسایہ سے ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس کے ساتھ ایسے روابط قائم رکھے جائیں کہ ضرر کا سد باب ہو اور نفع مل سکے یعقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ پڑوس کے تخریبی پہلو سے بچ کر اس کے تعمیری پہلو سے فائدہ اٹھایا جائے۔

سرسری جائزہ

حقوق :- ہمسایہ کے حقوق کا اندازہ مشکل ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جبریلؑ مجھے ہمسایہ کے بارے میں یہاں تک تاکید کرتے رہے کہ میں سمجھا اسے وارث قرار دینے لگے ہیں۔

ہمسایہ اگرچہ وارث نہیں ہوتا لیکن اسلامی قانون میں شفعہ کا حق بہت حد تک اسی کو حاصل ہے۔

ہمسایہ سے حُسنِ سلوک اور اس کے حقوق کی بجا آوری کے بارہ میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عمومی ہدایات صادر فرمائی ہیں ان میں سے چند حسب ذیل ہیں۔

تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوگا جب تک وہ اپنے پڑوسی کے لئے بھی وہ چیز پسند نہ کرے جو اسے خود پسند ہے۔

جو شخص اللہ تعالےٰ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اُسے چاہئے کہ اپنے پڑوسی سے حُسنِ سلوک رکھے۔

اللہ تعالےٰ کے ہاں بہترین ساتھی وہ ہے جو اپنے ساتھیوں کے حق میں بہترین ہے۔ اور بہترین پڑوسی وہ ہے جو اپنے پڑوسیوں کے حق میں بہترین ہے۔

پڑوسی کے حق اس قدر گوناگوں ہیں کہ ان کے بجا لانے کے لئے بہت حوصلہ اور استقامت کی ضرورت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ کہ تم جانتے ہو کہ پڑوسی کا حق کیا ہے۔ قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ کہ پڑوسی کی حق رسانی وہی کرتا ہے جس پر اللہ کی رحمت ہو۔

حضورؐ کی مُراد یہ ہے کہ اس گراں بار فریضہ کو اٹھانا آسان نہیں۔ آدمی اس سے جبھی عہدہ برا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کی تائید حاصل ہو۔

جو شخص اپنے پڑوسی کا حق ادا نہیں کرتا اس کا پڑوسی اللہ کے دربار میں اس سے انصاف چاہے گا۔

حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے روز اوّلین فریقین مقدمہ دو ہمسائے ہوں گے۔ ارشادِ نبوی ہے کہ قیامت کے دن کتنے ہی پڑوسی اپنے پڑوسیوں کو پکڑے ہوئے ہوں گے۔ اور کہیں گے کہ انہوں نے ہم پر بھلائی کا دروازہ بند کر دیا تھا۔

ہمسایہ کے حقوق کی بجا آوری اخلاق کی کسوٹی ہے۔ ایک دفعہ ایک صحابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کیسے علم ہو کہ میرا عمل اچھا ہے یا بُرا فرمایا تو جب اپنے پڑوسیوں سے سُنے کہ تو نے اچھا کیا ہے تو سمجھ لے کہ تو نے اچھا کیا ہے اور جب ان سے سُنے کہ تو نے بُرا کیا ہے تو سمجھ لے کہ تو نے بُرا کیا ہے۔

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث میں پڑوسی کے مختصر مندرجہ ذیل حقوق گنائے گئے ہیں۔

مدد طلب کرے تو اسے مدد دو!

ادھار مانگے تو اسے ادھار دو

محتاج ہو تو اس کی طرف توجہ کرو۔

بیمار پڑے تو اس کی عیادت کرو

اسے خوشی نصیب ہو تو مبارکباد دو

اس پر مصیبت آئے تو دلجوئی کرو۔

مر جائے تو جنازہ میں شرکت کرو۔

اس کی اجازت کے بغیر اپنی عمارت اتنی بلند نہ کرو کہ اس کے لئے ہوا میں رکاوٹ ہو۔ اسے اپنی ہنڈیا کی بو کی تکلیف نہ دو مگر اس صورت میں جائز ہے کہ اسے بھی پکا ہوا بھیجو پھل خرید کر لاؤ تو اسے بھی دو ورنہ گھر میں چھپا کر داخل کرو تمہارے بچے اسے لیکر باہر نکلنے نہ پائیں۔ تاکہ اس کے بچوں میں حرص پیدا نہ ہو۔

تجزیہ۔ پڑوسی کے حقوق کو ذیل کے عنوانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ مجلسی ادارے۔ (۲) تحائف اور دعوتیں۔

(۳) تعاون و ایثار۔ (۴) پڑوسی کو ضرر نہ دینا۔

(۵) پڑوسی کے ضرر پر صبر کرنا۔

مجلسی ادارے۔

محلہ داری کے مجلسی اجتماع کی بنیاد نماز ہے۔ ہر شخص پر واجب ہے کہ محلہ کی مسجد میں باجماعت نماز ادا کرے، مرد کو گھر میں بغیر کسی عذر کے نماز پڑھنے کی اجازت نہیں مسجد کی نماز کا ایک فائدہ یہ ہے کہ پڑوس کے سب مسلمانوں کو دن میں پانچ مرتبہ اکٹھے ہونے کا موقع ملتا ہے۔ ایک دوسرے کے احوال کو جاننے اور مجلسی اور انفرادی ضروریات سے باخبر ہونے ہیں تاکہ ایک دوسرے کے کام آسکیں، معاشرہ کو مضبوط کریں۔ اور ہم مل کر ترقی کی منازل طے کریں۔

مجلسی اجتماعات مسجد تک محدود نہیں محلہ میں ایسے ادارے قائم کرنے چاہئیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کریں اور فلاحی کاموں کا بیڑا اٹھائیں۔ جس طرح گھر کی تنظیم ضروری ہے، اسی طرح اہل محلہ کی تنظیم بھی ضروری ہے۔ ورنہ ایک دوسرے کی تعمیری صلاحیتوں سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

۲- تحائف اور دعوتیں۔

محلہ داری کا دوسرا اہم فریضہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کی وقتاً فوقتاً دعوت کی جائے اور تحائف بھیجے جائیں۔

جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے تحائف کو محبت کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ جناب ابوذر سے فرمایا کہ جب تو کچھ پکائے تو شوربہ زیادہ بنانا اور اس میں سے کچھ پڑوسیوں کو بھیج۔ آپؐ نے ایک دفعہ مسلمان عورتوں سے فرمایا کہ ہمسائی اپنی ہمسائی کا کوئی تحفہ حقیر نہ جانے، چاہے یہ بکری کا کھر ہی کیوں نہ ہو۔ مطلب یہ کہ چیز کی مقدار یا قیمت کو نہ دیکھو بلکہ ایثار و محبت پر نگاہ رکھو۔

ایک دفعہ حضرت فاروق اعظمؓ نے دیکھا کہ حضرت جابرؓ کچھ گوشت اٹھائے جاتے ہیں

آپؓ نے پوچھا یہ کیا ہے عرض کی کہ یا امیر المومنین گوشت کو جی چاہ رہا تھا ایک درہم کا خرید کر لا رہا ہوں فرمایا کیا تم اپنے پڑوسی یا عم زادہ کو چھوڑ کر اپنا پیٹ بھرنا چاہتے ہو کیا یہ آیت بھول گئے۔

اَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا۔ تم نے دنیوی زندگی میں ہی اپنے مزے لوٹ لئے اور خوب استعمال کر لیا۔

یہ خطاب آخرت میں کفار کو ہو گا جن کا یوم قیامت پر یقین نہیں اہل اسلام کو بھی اس سے درس لینا چاہئے۔

۳۔ تعاون و ایثار۔

محتاج اور مصیبت زدہ ہم سایہ کی امداد نہایت ضروری ہے۔ اور اس سے گریز کرنا منافقانہ حرکت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ وہ مومن نہیں جو خود سیر ہو کر کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔ آپ نے فرمایا کہ جس شخص نے بھرے ہوئے پیٹ کے ساتھ رات گذاری اور اسے علم تھا کہ اس کا پڑوسی بھوکا پڑا ہے وہ مجھ پر ایمان نہیں لایا۔ پڑوسی کی دست گیری سے کسی وقت بھی دریغ نہ کرنا چاہئے چاہے اس میں خود نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ اس عظیم ذمہ داری کے بجالانے میں نہایت فراخ دلی بلند حوصلگی اور ایثار کی ضرورت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کوئی شخص اپنی دیوار میں پڑوسی کو شہتیر رکھنے سے نہ روکے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے یہ حدیث بیان کر کے ان لوگوں کو خوب زبردو توبیخ کی جن کا عمل اس کے خلاف تھا۔ ظاہر کی نگاہ تو یہی بتائے گی کہ جو شخص دیوار کا مالک ہے اسے حق حاصل ہے کہ دوسرے آدمی کو شہتیر رکھنے سے منع کرے لیکن اسلام پڑوسی کو اس دیوار پر ہمسائگی کے واسطہ سے کچھ اخلاقی حق ضرور دلواتا ہے۔

اسی نوعیت کا ایک مسئلہ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں پیش آیا۔ دو صحابیوں کا کھیت کا پڑوس تھا۔ ان میں سے ایک صاحب ضحاکؓ بن قیس نے دوسرے صحابی محمد بن مسلمہؓ کے کھیت سے پانی گذار کر اپنے کھیت تک پہنچانا چاہا۔ محمدؓ بن مسلمہ نے انکار کیا معاملہ عدالت

فاروقی تک پہنچا۔

آپ نے محمد بن مسلمہؓ سے کہا کہ پانی گذر نے دیں آپ کے پڑوسی کو بھی فائدہ ہے اور آپ خود بھی اس پانی سے کام لے سکتے ہیں انہوں نے نہ مانا حضرت عمرؓ نے پھر اصرار کیا مگر محمد بن مسلمہؓ اپنی بات پر اڑے رہے۔ آخر فاروق اعظمؓ نے فرمایا واللہ یہ پانی ضرور گذرے گا چاہے تمہارے پیٹ پر سے ہو کر جائے۔ چنانچہ ان کے کھیت میں سے نہر گذاری گئی۔

پڑوسی کو ضرر نہ دینا۔

ہر ہمسایہ کی یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ اس کے ہمسایہ کو اس کے قرینہ سے کبھی ناراضگی کا موقع نہ ملے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تو نے ہمسایہ کے کتے کو پتھر مارا تو ہمسایہ کو دکھ دیا۔

ایمان کا تقاضا ہے کہ پڑوسی کی ایذا دہی سے پرہیز کیا جائے تاجدار انبیا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو آدمی اللہ تعالےٰ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے پڑوسی کو دکھ نہ دے ایک بار آپؐ نے فرمایا اللہ کی قسم وہ مومن نہیں، اللہ کی قسم وہ مومن نہیں اللہ کی قسم وہ مومن نہیں۔

پوچھا گیا یا رسول اللہؐ کون، فرمایا جس کے ضرر سے اس کا پڑوسی مامون نہیں۔ پڑوسی کو ضرر دینا وحشیانہ اور انسانیت سوز حرکت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بیان فرمائی ہے کہ لوگ اپنے پڑوسیوں کو قتل کریں گے۔ ہمسایہ کی ایذا رسانی کی اللہ تعالےٰ کے ہاں بڑی سزا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ چوری حرام ہے مگر دس گھروں کی چوری سے بڑھ کر ہمسایہ کی چوری ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلاں عورت کے نماز روزہ اور خیرات کا بڑا چرچا ہے لیکن اس نے زبان سے پڑوسیوں کو تنگ کر رکھا ہے۔

فرمایا یہ دوزخ میں جائے گی۔ پھر اس نے کہا کہ فلاں عورت کے بارے میں

سنتے ہیں نماز روزہ واجبی طور پر کرتی ہے پنیر کے ٹکڑوں کا صدقہ دیتی ہے اور پڑوسیوں کو نہیں ستاتی۔ فرمایا وہ جنت میں جائے گی۔

فتح مصر کے دوران فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص نے ایک چھاؤنی سے کوچ کا حکم دیا۔ سپاہی خیمہ اکھاڑنے لگے تو دیکھا کہ فاتح مصر کے خیمہ پر ایک کبوتری نے آشیانہ بنا کر انڈے دے رکھے ہیں۔

آپ نے کہا یہ کبوتری ہماری ہمسایہ ہے جب تک انڈوں سے بچے نکل کر اڑنے کے قابل نہ ہو جائیں اس وقت تک خیمہ کو نہ اکھاڑا جائے۔ خیمہ کو بحال رہنے دو آپ نے آشیانہ پر ایک محافظ مقرر کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد جب واپس آئے تو خیمہ کے گرد ایک شہر بسایا جس کا نام فسطاط (خیمہ) رکھا یہ نام آج تک اسلامی ہمسایہ نوازی کی یادگار ہے۔

پڑوسی کے ضرر پر صبر کرنا۔

اسلام پڑوسی پر ستم کرنے سے ہی نہیں روکتا بلکہ حکم دیتا ہے کہ اگر اس سے تکلیف پہنچے تو صبر و تحمل سے کام لو اور حتی الوسع درگزر کرو۔ آغاز اسلام میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے کافر پڑوسی آپ کو اس حد تک تنگ کرتے کہ ناک میں دم کر دیتے۔

کئی دفعہ آپ کے گھر جا کر ہنڈیا میں گندگی ڈال آتے۔ لیکن آپ اتنا کہہ کر چپ ہو جاتے کہ اے بنو عبد مناف یہ کیا پڑوس ہے۔

ایک صحابی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت لے کر آئے۔ آپ نے فرمایا جاؤ صبر کرو۔ وہ تین بار ایسے گئے آخر آپ نے فرمایا گھر کا سامان رستہ میں ڈال دو (جیسے کوئی گھر سے نکل رہا ہو) صحابی نے ایسا ہی کیا گذرنے والوں نے پوچھا کیا ماجرا ہے انہوں نے پڑوسی کی بدسلوکی کا ذکر کیا۔ لوگوں نے پڑوسی کو برا بھلا کہا۔ وہ ان صحابی کے پاس آیا اور کہا آپ سامان اندر لے جائیں۔ آئندہ آپ میری کوئی حرکت ناگوار نہ پائیں گے۔

باب (۲۴)

عامۃ المسلمین کے حقوق

اس جگہ عام طور پر شہری کے حقوق کا ذکر کیا جاتا ہے لیکن شہری کا تعلق چونکہ ریاست سے ہے اس لئے شہری کے حقوق ریاست کے ضمن میں بیان کئے جائیں گے۔ اس جگہ ان حقوق کا ذکر ہے جو ایک عام مسلمان کے وہ حقوق ہیں جو ایک دوسرے مسلمان کے ... کیونکہ جس طرح شہری کا تعلق ریاست سے ہے اسی طرح ایک عام مسلمان کا تعلق ... سے ہے۔

معاشرے کے سلسلے میں قریبی رشتہ دار پڑوسی۔ اور عام مسلمان آتے ہیں اس لئے ... گی اس تیسری کڑی کا ذکر کیا جائے گا جو عامۃ المسلمین میں سے ایک مسلم ہے۔

اور چونکہ پڑوسی کے ضمن میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ مسلمان کے دوسرے غیر مسلم پڑوسی سے زیادہ حقوق ہیں۔ اسی طرح یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ایک عام مسلمان کے حقوق یقیناً ایک غیر مسلم سے زیادہ ہیں۔

اہمیت

ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کے ساتھ ... رشتہ ...

حدیث میں ہے۔ المسلم اخو المسلم ... کا ...

ہے

اسلامی تاریخ میں اس ... زندگی ...

رشتہ کے قائم ہونے کے بعد ایک اجنبی مسلمان غیر مسلم قریبی سے قریب تر ہوتا ہے۔
یہ وہ اسلامی رشتہ ہے جس کی سب سے پہلے بنیاد ہجرت مدینہ کے بعد مہاجرین اور
انصار میں قائم ہوئی۔ یہ رشتہ جس ایثار قربانی اور ہمدردی اور بے نفسی کے جذبات
سے نبھایا گیا وہ تاریخ میں روشن اور درخشاں ہے۔

قرآن پاک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کی تعریف ان الفاظ
میں بیان کی گئی ہیں۔

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ
بَيْنَهُمْ ۔ حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جو لوگ ان کے ساتھی ہیں
ان کی صفت یہ ہے کہ وہ کفار پر شدید تر ہیں اور آپس میں رحیم اور مہربان ہیں۔

ایک دوسرے مقام پر ان کی یہ صفت ذکر کی گئی ہے۔

اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ ۔ وہ لوگ ایمان
والوں کے لئے سراپا انکسار اور کافروں کے اوپر غلبہ اور فوقیت کے جذبات رکھتے ہیں۔
اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی یہ تعریف فرمائی ہے۔

اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ
مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ اور سلامت رہیں۔

حقوق و فرائض۔

(مندرجہ ذیل ہیں)

(۱) وہ جو چیز اپنے لئے پسند کرتا ہو وہی اپنے مسلمان بھائی کے لئے بھی کرے اور جس
چیز کو خود برا سمجھتا ہے وہ اور مسلمان بھائیوں کے لئے بھی بری اور ناپسند قرار دے
کیونکہ تمام مسلمان ایک جسم واحد کی طرح ہیں جس طرح جسم کے ایک حصہ کو
تکلیف پہنچنے پر تمام جسم کو تکلیف ہوتی ہے اسی طرح مصیبت تکلیف اور کلفت
میں پڑے ہوئے دوسرے مسلمان کی تکلیف کو بھی اپنی تکلیف سمجھنا چاہئے۔

(۲) اپنے قول و فعل سے کسی مسلمان کو ایذا نہ دے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان کی تعریف ہی یہ کی ہے کہ اس کی زبان اور ہاتھوں سے کسی دوسرے مسلمان کو ایذا نہ پہنچے اور فقط یہی نہیں کہ دوسروں کو ایذا نہ پہنچائے بلکہ یہ بھی ضروری ہے۔ کہ حتی الامکان تکلیف دہ چیزوں کو اس سے دور رکھے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی مجھے کوئی ایسی چیز بتائیے جس سے فائیدہ اٹھاؤں۔ آپؐ نے فرمایا۔ مسلمانوں کا راستہ سے تکلیف دہ چیزوں کو ہٹا دو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو راحت وآرام کا کہاں تک خیال تھا۔

(۳) تواضع اور انکساری سے پیش آئے۔ اور تکبر نہ کرے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ متکبر اور شیخی خورے کو پسند نہیں کرتے۔ ارشاد ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ۔ بے شک اللہ تعالےٰ تمہیں دوست رکھتا ہر اکڑنے والے تکبر کی چال چلنے والے اور شیخی باز کو۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالےٰ نے میری طرف وحی کی ہے۔

کہ تواضع اختیار کرو۔ تاکہ کوئی کسی پر فخر نہ کرے۔

(۴) ناراضگی کی بنا پر تین دن سے زیادہ قطع کلام نہ کرے۔ آپؐ نے فرمایا کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں کہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ عرصہ تک علیحدگی اختیار کرے کہ جب وہ ایک دوسرے کے سامنے ہوں تو ایک دوسرے سے منہ پھیر لیں۔ اور دونوں میں سے اچھا وہ ہے سلام کرنے میں یعنی کلام کی ابتدا کرنے میں پہل کرے ظاہر ہے کہ کلام کرنے میں سب سے پہلے سلام کہا جاتا ہے۔ ایک اور مقام پر فرمایا کہ جو آدمی کسی مسلمان کی لغزش معاف کر دے اللہ تعالےٰ قیامت کے دن اس کی لغزش کو معاف فرما دیں گے۔

(۵) کسی کے ہاں بغیر اجازت کے نہ جائے۔ اور اجازت کے لئے تین دفعہ آواز دے یا دروازہ کھٹکھٹائے اور دروازے کے سامنے بھی کھڑا ہو کر جواب کا انتظار نہ کرے

سورہ نور میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

(۶) سب مسلمانوں کے ساتھ حسن سلوک کے ساتھ پیش آئے۔

(۷) بزرگوں کی عزت کرے اور چھوٹوں پر رحم کرے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ مَنْ لَّمْ یُوَقِّرْ کَبِیْرَنَا وَیَرْحَمْ صَغِیْرَنَا فَلَیْسَ مِنَّا جو شخص بڑوں کی توقیر نہیں کرتا اور چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا وہ مسلمان نہیں بڑوں سے مراد اپنے سے بڑی عمر والے بھی ہیں اور آقا اور امیر اور حاکم بھی ہیں اور چھوٹے سے مراد عمر کے لحاظ سے چھوٹے بھی اور رتبہ اور منصب میں چھوٹے بھی ہیں۔

(۸) سب کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات پر جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔

(۹) اگر وعدہ کرے تو پورا کرے۔ قرآن پاک میں بھی اللہ تعالےٰ کا حکم ہے کہ اے ایمان والو اپنے وعدوں کو پورا کرو کہ اس کے متعلق قیامت میں باز پرس ہوگی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے۔ وعدہ فرض ہے اور فرمایا کہ منافق کی چار خصلتیں ہیں۔

(۱) جب بات کرتا ہے جھوٹ بولتا ہے۔

(۲) جب وعدہ کرتا ہے تو اس کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

(۳) جب اس کے پاس امانت رکھی جاتی ہے خیانت کرتا ہے۔

(۴) اور جب بات کرتا ہے تو فحش کلامی کرتا ہے۔

۱۰۔ اپنی طرف سے دوسروں کے ساتھ پورا پورا انصاف کرے اور وہی کرے جو کرنا ضروری ہو۔

۱۱۔ مسلمانوں کے درمیان اگر ناراضگی پیدا ہو جائے تو صلح کرا دے۔ جس وقت اسے موقع ملے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ایسا عمل نہ بتاؤں جس کا درجہ نماز روزہ زکوٰۃ اور حج سے زیادہ ہے۔ صحابہ نے کہا ہاں یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

(۱۱) آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں کے درمیان صلح کرانا ان سب سے افضل ہے۔ جھوٹ بولنا برا ہے لیکن اس مقصد کے لئے جھوٹ بولنے کی بھی اجازت ہے۔

۱۲۔ مسلمانوں کی پردہ پوشی کرے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو آدمی کسی کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ ایک اور حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو مومن اپنے کسی بھائی کے عیب کو دیکھ کر پردہ پوشی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کریں گے۔

۱۳۔ ایسے مقامات سے کنارہ کشی کرے جہاں پر تہمت کا اندیشہ ہو۔ تاکہ دوسروں کے دل بدگمانی سے محفوظ رہیں۔ اور ان کی زبانیں اس کی غیبت سے بچی رہیں۔

۱۴۔ جن لوگوں تک اس کی رسائی ہے محتاج مسلمانوں کے متعلق ان کے پاس سفارش کرے اور حتی الامکان ان کی حاجت روائی میں کوشش کرے۔

۱۵۔ جب دو مسلمان آپس میں ملیں تو بات کرنے سے پہلے سلام دیں اور مصافحہ کریں۔ اس کی حدیث میں بہت تاکید ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب دو مسلمان آپس میں ملتے ہیں اور مصافحہ کرتے ہیں تو جدا ہونے سے پہلے ان کی بخشش ہو جاتی ہے

۱۶۔ دوسرے مسلمان کی جان، مال، آبرو اور عزت کی حفاظت کرے اور کسی دوسرے کو حتی الامکان اس کے ساتھ زیادتی نہ کرنے دے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر اس چیز کی بڑی تاکید فرمائی تھی۔

۱۷۔ ایک مسلمان چھینک مارے تو دوسرا مسلمان اس کا جواب دے یعنی چھینک مارنے والا الحمد للہ کہے تو پاس بیٹھنے والا مسلمان یرحمک اللہ کہے اور اس کے جواب میں پھر چھینک مارنے والا کہے یہدیکم اللہ ویصلح بالکم

۱۸۔ دولت مندوں کی مجلس سے دور رہے اور مسکینوں کے پاس بیٹھے اور غریبوں سے حسن سلوک سے پیش آئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ مجھے مسکینی کی حالت میں زندہ رکھ اور اسی حالت میں موت دے اور قیامت کے دن بھی مجھے مسکینوں کے ساتھ اٹھا۔ اور آپ فرماتے ہیں کہ مسکینوں کا ساتھ [illegible]

جس میں کوئی یتیم ہے اور اس سے اچھا سلوک کیا جاتا ہے۔ سب سے بُرا گھر وہ ہے جس میں یتیم کے ساتھ بدسلوکی کی جاتی ہے۔

۱۹۔ ہر مسلمان کے لئے خلوص رکھے اور اس کے دل کو خوش کرنے کی کوشش کرے۔

۲۰۔ بیمار کی بیمار پرسی کرے۔

۲۱۔ جنازے کے ساتھ جائے اور اگر ہو سکے تو دفن تک وہیں ٹھیرے حدیث میں اس کا بڑا ثواب لکھا ہے۔

۲۲۔ مسلمانوں کی قبروں کی زیارت کرے اور اس کا مقصد عبرت حاصل کرنا ہو اور اصحاب قبور کے لئے دعائے مغفرت کرے اور اس طرح اپنے دل کی رفعت کا سامان کرے

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے حقوق و فرائض ہیں اور یہ تمام ایسے امور ہیں جن کے متعلق قرآن و حدیث میں صراحت کے ساتھ ذکر موجود ہے

اگر اسلامی معاشرے کے تمام افراد اپنے ان فرائض کو جانتے ہوئے ان کو صحیح طور پر ادا کرنے کی کوشش کریں۔ تو دنیا میں واقعی ایک انقلاب عظیم بپا ہو سکتا ہے اور یہ انقلاب ایسا ہے جو عین مقتضائے فطرت ہے۔ لیکن دعوت اسلام کرنے والے پر خود غلط قسم کے رہنما اور اسلامی تعلیمات سے بے بہرہ اور خود کو افلاطون کا جانشین سمجھنے والے نئی روشنی اور مغربی تہذیب سے مسحور وجود و مصلحین قوم آخر بتائیں کہ وہ قوم کو کس طرف لے جا رہے ہیں کیا ان کی منزل مقصود کعبہ ہے یا نیویارک اور پیرس یا ماسکو اور پیکنگ۔ حکیم الامت نے سچ کہا ہے کہ دعویٰ آسان ہے خلوص مشکل ہے۔ فرماتے ہیں

چوں می گویم مسلمانم بلرزم ۔ کہ دانم مشکلات لا الٰہ را

جب میں اسلام کا دعویٰ کرتا ہوں، دل میں کانپ اٹھتا ہوں، مجھے اس اعلان اسلام اور اس پر پوری طرح عمل پیرا ہونے کے تصور میں جو مشکلات نظر آتی ہیں مجھے بے چین کر دیتی ہیں۔

۱۔ اقارب کون لوگ ہیں۔ صلہ رحمی سے کیا مراد ہے۔
۲۔ ہمسائے کے حقوق بیان کریں، اور یہ بھی بتائیں کہ اسلام نے ان کی تاکید و کہاں تک اہتمام کیا ہے۔
۳۔ مسلمانوں کے باہمی حقوق و فرائض کی وضاحت کریں۔ اور واضح کریں کہ علامہ اقبالؒ کے شعر کا جو آخر میں درج ہے کیا مطلب ہے۔

باب (۲۵)

ریاست

مفہوم۔

ریاست چار عناصر پر مشتمل ہے۔

۱۔ علاقہ

۲۔ باشندے

۳۔ نظم و نسق

۴۔ اختیارات یا حکمرانی کی حدود

ریاست اور حکومت میں فرق۔

حکومت اس ادارہ کا نام ہے جو کسی ریاست کا نظم و نسق چلاتا ہے۔ حکومت ریاست کی خادم ہوتی ہے۔ حکومت کو حسب ضرورت بدلا جا سکتا ہے۔

ریاست کی اہمیت۔

دین کی اشاعت

دین کے استحکام اور اشاعت کے لئے ریاست کا وجود اگرچہ لابدی نہیں لیکن مفید ضرور ہے۔

آغاز اسلام میں جب تک اہل اسلام مکہ تک محدود تھے دین کی اشاعت بھی محدود تھی۔ ہجرت کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں ایک آزاد

اور خود مختار ریاست قائم فرمائی تو اسلام نہایت تیزی سے اشاعت پذیر ہونے لگا۔

تنظیم :-

ریاست کے بدولت قوم ایک رشتہ میں منسلک رہتی ہے اور انتشار سے محفوظ رہتی ہے۔ ریاست قوم کو ایک مرکز پر جمع کر کے منظم کرتی ہے۔

حکومت اور اس کے سربراہ کے بغیر قوم کی وحدت پریشان ہو جاتی ہے۔ اور زندگی کے ہر شعبہ میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تین آدمی سفر پر نکلیں تو اپنے میں سے ایک کو اپنا امیر مقرر کر لیں۔

حکومت نہ ہو تو قوم میں اجتماعی قوت پیدا نہ ہو سکے، بلائیں اور مصائب اس میں پنجہ گاڑ لیں دشمن کی فوج اسے پامال کر دے اور اس کے لئے دنیا میں کوئی باعزت مقام نہ ہو۔ حکومت قوم کو منظم کر کے ہلاکت کی ہر یورش کا مقابلہ کرتی ہے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

حکومت کا سربراہ ڈھال ہوتا ہے جس کی اوٹ میں (دشمن سے) جنگ کی جاتی ہے اور مصائب سے بچاؤ کیا جاتا ہے

قومی ترقی :-

حکومت سب ذرائع وسائل کو ایک تنظیم میں لا کر افراد کی متحدہ قوت کے ذریعے قوم کو ترقی کی راہ پر چلاتی ہے۔ قومی ترقی کے لئے بعض دفعہ بڑے بڑے منصوبوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ افراد کے بس کے نہیں ہوتے حکومت ہی ان کا بیڑا اٹھا سکتی ہے

حکومت قائم کرنے کی تاکید

قرآن حکیم اور احادیث میں حکومت قائم کرنے اور امراء کی اطاعت کی بہت تاکید آئی ہے۔ جو آدمی ریاست کا قائل نہ ہو اور قوم کے منتخب کردہ سربراہ حکومت کو بغیر کسی دینی سبب کے نہ مانتا ہو وہ دوزخی ہے جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

(۱) جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

(۱) اور جس نے میری نافرمانی کی اُس نے اللہ کی نافرمانی کی جس نے امیر کی اطاعت کی اُس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

(۲) اگر تم پر کوئی نکٹا غلام بھی حاکم ہو جائے اور کتاب اللہ کے بموجب حکم چلائے تو اس کی بات سنو اور حکم مانو۔

(۳) جو آدمی اس حالت میں مرے کہ اس کی گردن میں کسی امام کی بیعت نہ ہو (یعنی سربراہ حکومت کا باغی ہو) تو وہ کفر کی موت مرا۔

اقتدارِ اعلیٰ ۱۔ مثالی اقتدار اعلیٰ میں مندرجہ ذیل اوصاف کا ہونا اشد ضروری ہے۔

(۱) وحدت :۔

اقتدار اعلیٰ کا صرف ایک مرکز ہو اگر ایک سے زاید مرکز ہوں۔ اور ایک دوسرے سے آزاد ہوں تو ان میں سے کسی پر اقتدار اعلیٰ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اقتدار اعلیٰ نا قابل تقسیم ہونا چاہیے یہی حقیقی وحدت ہے۔

(۲) تعین :۔

یہ بخوبی معلوم ہو کہ اقتدار اعلیٰ کس کے پاس ہے بچے سے لے کر بوڑھے تک کو اسی کا نام معلوم ہو۔ اور وہ اس کی اطاعت پر دل و جان سے یقین رکھتے ہوں قوم کو اس کے بارے میں تذبذب نہ ہو۔

(۳) حقیقت :۔

اقتدار اعلیٰ حقیقی ہو یعنی اس کا وجود برائے نام نہ ہو۔ کوئی اور ہستی اس کو اپنے اشاروں پر رقص کرانے والی نہ ہو۔ ایسا بھی نہ ہو کہ قانون تو اس کے نام سے چلتا ہو لیکن قانون بنانے والا کوئی اور ہو۔ یا کوئی قوی تر طاقت اسے قانون بنانے یا بدلنے پر مجبور کرے۔

(۴) حکمت :۔

اقتدار اعلیٰ حکیمانہ بصیرت سے متصف ہو غلطی اور خطا سے مبرا ہو کیونکہ ایک ہی

غلطی بعض دفعہ پوری کی پوری ریاست کو فنا کر دیتی ہے۔

(۵) اقتدار اعلیٰ کو عادل ہونا چاہیئے ہوس یا جنبہ داری اس کے فیصلہ کو ملوث نہ کرے۔

۶۔ پائیداری :-

اقتدار اعلیٰ نے اپنے استحکام کا ناقابل تردید ثبوت مہیا کر دیا ہو اس کی قوت دلوں پر اس قدر چھا گئی ہو کہ کسی کو اس کی حکومت کا تختہ الٹنے کا خیال تک نہ آسکے۔

(۷) زوال ناپذیری :-

اقتدار کی پائیداری دائم ہونی چاہیئے۔ نہ تو انحطاط قبول کرے، نہ اس کی حدود کم ہوں۔ نہ اس کی قوت میں ضعف آسکے اور نہ یہ مٹ ہی سکے مختصراً ازلی و ابدی ہو۔ مندرجہ بالا اوصاف سوائے اللہ تعالےٰ نہ کسی فرد میں ہو سکتے ہیں اور نہ کسی انسانی میں اس لیئے اسلام اللہ تعالےٰ کو ہی اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتا ہے قرآن حکیم بتاتا ہے۔ کہ انسان کی حیثیت اس زمین پر صرف ایک نائب کی ہے۔ جو دینا در شریعت کے احکام کا نفاذ کر کے حاکم اعلیٰ یعنی اللہ تعالےٰ کی خوشنودی حاصل کرتا ہے بقول علامہ اقبالؒ۔ سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے

حکمراں ہے اِک وہی باقی بُتانِ آذری

خلافت ارضی :-

اللہ تعالےٰ نے انسان کو بحیثیت مجموعی زمین پر اپنا نائب بنایا ہے۔ اس نائب کے ذمے سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالےٰ کے حکم کو دنیا میں بلند کرے اور اس کے آئین کا نفاذ کرے۔

اللہ تعالےٰ قرآن حکیم میں ارشاد فرماتے ہیں۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ

اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کریں عبادت کے دو گونہ معنی ہیں۔ ایک یہ کہ حمد و ثنا کرے جو طریقے اللہ تعالےٰ نے بتائے ہیں ان پر عمل کیا جاتے اس میں نماز دعا اور باقی عبادتیں آجاتی ہیں۔ دوسرے یہ

اللہ کے احکام کی تعمیل کی جائے۔

جن وانس کے سوا دوسری اشیا اللہ تعالے کے حضور میں صلوٰۃ و تسبیح کا ہدیہ از خود پیش کرتی رہتی ہیں اور اپنے فرائض کو جبلی طور پر بخوبی ادا کرتی رہتی ہیں لیکن انسان کی فطرت میں آزادی کا میلان ہوتا ہے اس لئے اس پر کچھ پابندیاں تجویز کر دی گئی ہیں اور کچھ قواعد و ضوابط بر قرار کر دیئے گئے ہیں کہ انہیں فرماں برداری کے طور پر پورا کرے اور ان میں نہ پہلا نگتا پھرے۔

انسان سے . . . . . اللہ تعالے کی ہدایت اور قواعد کی پابندی کون کرائے گا خود انسان۔

یہ وہ ہستی ہے کہ خود ہی حاکم اور خود ہی محکوم ہے۔ انسان بڑا حاکم ہے لیکن حاکم اعلیٰ انسان اللہ کا نائب حاکم یعنی خلیفہ ہے۔ مطلق حکم صرف اللہ کے ہاتھ ہے۔

خلافت الٰہیہ کی دعویدار وہی قوم ہو سکتی ہے جو اللہ پر ایمان رکھتی ہو اس کے اقتدار اعلیٰ کو مانتی ہو۔ اس کے نازل کردہ احکام پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتی ہو۔ جو قوم اللہ پر ایمان نہیں رکھتی یا اس کے احکام کو تسلیم نہیں کرتی وہ لاکھ زور آور غالب اور بحر و بر پر چھائی ہوئی ہو خلافت الٰہی کے شرف سے محروم ہوتی ہے اگر کسی ملک میں کوئی حاکم اپنی طاقت بڑھا کر مرکزی حکومت سے باغی ہو جائے تو اس کے غلبہ اور تسلط کے باوجود اسے باغی ہی کہیں گے اور خدا کے جو بندے باغی ہو جائیں وہ خلیفہ نہیں رہتے۔

سورۃ نور میں اللہ تعالے نے ان بندوں کو خلافت دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔

جو

(۱) اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔

(۲) نیک کام کرتے ہیں۔

(۳) اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔

(۴) اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے۔ ملاحظہ ہو۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ

فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَهُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا ؕ وَمَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ اللہ نے تم میں سے ایمان والوں اور نیک اعمال کرنے والے لوگوں سے وعدہ کیا ہے کہ یقیناً ہم ان کو زمین پر خلیفۃ اللہ بنا دیں گے جس طرح کہ ہم نے تم سے پہلے لوگوں کو خلافت ارضی عطا فرمائی تھی۔ اور وہ قانون اور دین ان کے لئے پختہ کر دیں گے جس پر وہ رضامند ہو گئے۔ اللہ ان کے خوف و انتشار کو امن میں تبدیل کر دیں گے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ صرف میری ہی عبادت کریں گے۔ اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں گے۔ اور جو کوئی اس کے باوجود انکار اور کفر کا رویہ اختیار کرے گا۔ وہ لوگ فاسقوں میں شمار کئے جائیں گے۔

آیت کے آغاز میں آمنوا منکم کے الفاظ ہیں یعنی تم میں سے جو لوگ ایمان لائے یہ الفاظ صاف وضاحت کر رہے ہیں کہ جن میں مذکورہ اوصاف نہ ہوں وہ خلافت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔

خلافت کی اہل قوم کے ساتھ اللہ کا وعدہ ہے کہ دین ان کے لئے مستحکم کر دیا جائے گا۔ یعنی کہ اگر وہ خود دین پر سختی سے قائم رہیں گے دین سے ہٹ کر خلافت الہیہ کا قیام نہیں ہو سکتا۔

خلافت کا اہل ہونے کے لئے یہ تو لازم ہے کہ مومن قوم کو اپنے وطن میں پورا تمکن اور استحکام حاصل ہو۔ اغیار کی طرف سے مامون اور بے خوف ہو لیکن یہ ضروری نہیں کہ ساری دنیا پر غلبہ پا جائے حضرت داؤد کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں خلیفہ کہا ہے آپ ساری دنیا کے حاکم نہ تھے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک اور خلافت راشدہ کے دور میں اسلامی قبضہ ساری دنیا پر نہیں ہو پایا تاہم یہ خلافت خلافت الہیہ تھی

خلافت امارت امامت حکومت

خلافت کے لئے امامت اور امارت کے الفاظ بھی آئے ہیں لیکن آخری دو لفظوں میں

حکومت سے اور بادشاہی کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ خلافت کا لفظ خاص ہے اور اصطلاحاً صرف اس امارت یا امامت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جو نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق عمل کی پیروی ہو۔ حکومت کا لفظ جدید زمانے میں نہایت وسیع مفہوم کے ساتھ بولا جاتا ہے، خلافت، امارت اور امامت سب پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

ہمارے لئے خلافت کی صحیح اور قابل تقلید مثال خلافت راشدہ کی ہے۔ ہر دور کی اسلامی حکومت کی اس کی پیروی کرنی چاہیئے۔

شوریٰ :-

خلافت کا حق پوری ملت کو عطا ہوتا ہے۔ ملت کے سب افراد نظم ونسق میں حصہ دار ہوتے ہیں۔

وہ باہم مشورہ کر کے اپنی رضا سے کچھ اختیارات ایک دین دار اور اہل شخص کو سونپ کر اسے رئیس اعلیٰ مان لیتے ہیں، یہ شخص اصطلاحاً خلیفہ کہلاتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالےٰ نے خلیفہ کہا ہے۔ کیونکہ قوم کی سربراہی ان کے ہاتھ میں تھی، وہ چونکہ نبی تھے اس لئے ان کا انتخاب مشورہ سے نہیں ہوا۔ ویسے خلافت کے لئے مشورہ ضروری ہے۔ اور یہ صرف نبی ہی کا مقام ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے ملت کا سربراہ اور کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ باہمی مشورہ کی اہمیت قرآن کی اس آیت سے ثابت ہو جاتی ہے۔

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ، یعنی مسلمانوں کے تمام معاملات باہم مشورہ سے طے پانے چاہئیں آج اسے عام طور پر جمہوریت کا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن اسلامی جمہوریت موجودہ جمہوری نظام سے مختلف ہے اس جمہوریت میں اقتدار اعلیٰ نہ قوم کے پاس نہ خلیفہ کے پاس بلکہ اللہ تعالےٰ کے پاس ہوتا ہے۔

خلیفہ کے تقرر اور عزل کا حق پوری قوم کو حاصل ہے، وہ آئے دن معاملات میں رائے دینے کا بھی پورا حق رکھتی ہے۔ خلافت کا تقاضا یہ ہے کہ شوریٰ پر مکمل طور پر عمل کیا جائے، تاکہ ملت کا ہر فرد خلافت میں حصہ دار بن سکے۔

انسان بحیثیت مجموعی اللہ تعالےٰ کا خلیفہ ہے، لیکن سوائے نبی کے کسی کو خلیفۃ اللہ کہنا درست نہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کسی نے خلیفۃ اللہ کہا تو آپ نے اُسے کہا کہ مجھے خلیفۃ اللہ نہیں بلکہ خلیفۂ رسول کہنا چاہیئے۔ حضرت عمرؓ کو بھی کسی نے خلیفۃ اللہ کہا تو انہوں نے فرمایا کہ خلیفۃ اللہ حضرت داؤد علیہ السلام تھے یا ان کی طرح کے اور پیغمبر۔

شوریٰ کی روح:۔

ضروری نہیں کہ عہد اور ہر ملک میں شوریٰ کی ایک ہی صورت رائج ہو۔ مقصود فقط یہ ہے کہ اس کے تقاضے پورے کیئے جائیں چاہے کسی طریقے سے ہوں۔

زندگی انفرادی ہو یا اجتماعی اس میں رسوم و قیود اور آئین اور قانونی بندھن اور پابندیاں اس وقت کام دیتی ہیں، جب تک دِلوں پر اخلاق کی حکومت ہو۔ قوم اعلیٰ کردار رکھتی ہو، اور دینی و دُنیوی کام کی خوب سمجھ رکھتی ہو، تو وہ زیادہ تکلّفات میں پڑے بغیر آئین اور قانون کی لاج رکھتی ہے۔ خلافت راشدہ کا دور ہمارے سامنے ہے یہ خلافت اور شوریٰ کے معاملات میں معیار اور مثال کا کام دیتا ہے۔ جو شخص قوم کا خادم ہوتا ہے وہی عزت اور اقتدار پاتا ہے۔ سب بڑے بڑے صحابہ عوام کے محبوب قائد تھے، انہوں نے کوئی الیکشن نہیں جیتے، لیکن عدیم المثال قربانیوں اور حکیمانہ بصیرت کی بدولت عوام کے دلوں پر حکومت کرتے تھے، ہوا و ہوس کا دخل نہ تھا اور نہ مَن و تو کی تکرار سننے میں آتی تھی۔ وہ جو فیصلہ کرتے تھے عوام اس پر عمل کرنے کے لیئے ہمہ تن آمادہ رہتے تھے۔ رہنماؤں کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ عوام کے دِلوں کی آواز ہوتے تھے، حکّام عوام پر فریفتہ تھے اور عوام حکّام پر مفتون۔ جنابِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بہترین حکام وہ ہیں جو تمہیں چاہتے ہوں۔ اور تم انہیں چاہتے ہو۔ جو تمہارے خیر خواہ ہوں اور تم ان کے خیر اندیش۔

حکومت کے فرائض:۔

(۱) بیت المال کا صحیح مصرف:۔

حکومت کا فرض ہے کہ وہ بیت المال کا صحیح استعمال کرے ایک ایک پائی صرف جائز اور

ضروری امور پر خرچ کرے۔ فضول خرچی کو دخل نہ ہو

(۲) جان و مال اور آبرو کی حفاظت۔

ہر شہری کی چاہے وہ مسلم ہو یا غیر مسلم' جان و مال اور آبرو کی حفاظت کرنا حکومت کے اولین فرائض میں شامل ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم۔ کی حیاتِ مبارک میں ایک اسلامی سفیر رومی حکومت میں شہید کر دیا گیا۔ آپ نے اس کا انتقام لینے کے لئے فوراً ایک لشکر روانہ فرمایا، جس کی تعداد تین ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ اور جسے رومیوں کی لاکھوں کی فوج سے ٹکر لینی تھی۔

لوگوں کی حفاظت کے لئے پولیس کا خاطر خواہ انتظام ہونا چاہیئے اگر کوئی شخص کسی کو زخمی کرے یا قتل کرے یا اس کی ہتک کرے یا اس کا مال دھوکے یا جبر سے ہتھیا لے تو اسے موزوں اور فوری سزا دے۔

(۳) قومی دفاع

حکومت کا فرض ہے۔کہ وہ اغیار کے مقابلے میں اسلحہ اور سازو سامان سے آراستہ فوج ہر وقت تیار رکھے۔ قرآنِ حکیم میں اس بارے میں تفصیل احکام ہیں ممکن ہو تو ہر مسلمان کو فوجی تربیت دی جائے۔

(۴) عہدوں پر اہل افراد کا تقرر

حکومت کی مشینری اس کے عملے سے چلتی ہے عہدوں پر موزوں ترین آدمی مقرر کرنے چاہئیں۔اس مقصد کے لئے جس قدر احتیاط اور تحقیق ہو سکے اس کا اہتمام کرنا چاہیئے۔ اگر عہدوں پر موزوں افراد کا تقرر ہو تو حکومت کی کامیابی میں کوئی کسر نہیں باقی رہ جاتی۔

(۵) قومی وحدت کی حفاظت۔

حکومت کے لئے لازم ہے کہ وہ رعایا سے جغرافیائی اور نسلی عصبیت کو دور رکھے عصبیت قوم کو گھن کی طرح کھا جاتی ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

۶ - حکومت کا فرض ہے کہ ملک میں نیکی کی اشاعت اور برائی کے استیصال کے لئے کوشاں ہے اسلامی حکومتوں میں اس فرض کے لئے احتساب کے صیغے قائم رہے ہیں قوم کی قوت کا انحصار اخلاق کی بلندی پر ہوتا ہے۔ اگر اخلاق اٹھ جائے اور بے غیرتی اور بداخلاقی رواج پکڑ جائے تو نہ قوم زندہ رہنے کے قابل رہتی ہے نہ حکومت ہی بقا کی حقدار، اور اس پر اللہ تعالے کی طرف سے ہمہ گیر عذاب نازل ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں دین کی حفاظت اور اسلامی شعار کی پامالی کی کڑی نگرانی اور تبلیغ دین حقہ کے فرائض حکومت کی اہم ذمہ داری ہے -

۷ - اہلِ ذمہ :-

اہل ذمہ ان غیر مسلموں کو کہتے ہیں جنہیں آج کل اقلیتیں کہا جاتا ہے اور جو اسلامی حکومت میں مستقل طور پر آباد ہوں، ان کے حقوق کی حفاظت اسلامی حکومت کی اہم ذمہ داری ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے خلفائے راشدہ اس معاملہ میں بڑے سخت گیر تھے وہ ہر ذمی کے حقوق ایک مسلمان کے برابر قرار دیتے تھے۔ ان کی جان ان کا مال ان کی آبرو تمام کا لحاظ اسی طرح کرنا چاہیئے اور ان کی حفاظت بھی اسی طرح کرنی چاہیئے جس طرح ایک مسلمان کی، وہ مذہبی آزادی کا پورا حق رکھتے ہیں انہیں مسلمانوں کے ساتھ معاشرتی اور معاشی مساوات میسر ہوتی ہیں۔

اہلِ ذمہ پر فوجی خدمت لازمی نہیں ہوتی اس کے عوض ان غیر مسلم اہلِ ذمہ کو جو فوجی خدمت کے قابل ہوں لیکن اس سے مستثنیٰ رہنا چاہیں ایک ہلکا سا ٹیکس ادا کرنا چاہیئے جسے جزیہ کہتے ہیں -

ذمیوں کے ذاتی قوانین کے لئے ان کے مذہبی قوانین پر عمل ہوتا ہے، ایسے معاملات میں ان کے درمیان کوئی تنازعہ اٹھ کھڑا ہو تو ان کے اپنے جج فیصلہ کرتے ہیں -

جو اہل ذمہ معذور اور اپاہج ہوں انہیں اسلامی بیت المال سے وظیفہ بھی دیا جاتا ہے-

الغرض ریاست امارت خلافت اور جہاں بانی کے جو قانون اسلام نے مقرر

کئے ہیں۔ وہ اس قسم کے اعلیٰ اور بہترین اور سہل العمل اور مثالی ہیں کہ تاریخ کا مطالعہ ثابت کرتا ہے۔
کہ غیر مسلم حکومتوں میں بھی اس معاملہ میں اسلامی طرزِ حکومت کی پیروی کی گئی اور اسے بہترین قرار دیا لیکن آج کل ہم مغرب کی تقلید میں اپنے زریں اصولوں کو خیرباد کہکر طرح طرح کی ایسی حکومتیں اور سیاسی پارٹیاں بنا رہے ہیں جو قابل عمل ہی نہیں بلکہ غیر فطری اور نقصان رساں ہیں۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی
کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی

(۱) اسلام میں ریاست کی اہمیت اور تصور کے متعلق مختصر نوٹ لکھیں۔
(۲) حاکم اعلیٰ کی کیا خصوصیات ہیں اور اسلام کی رو سے ریاست کا حاکم اعلیٰ کون ہو سکتا ہے۔
(۳) اسلامی ریاست کے فرائض کیا کیا ہے وضاحت کریں۔
(۴) اسلامی ریاست کے شہری کے حقوق و فرائض تفصیل سے لکھیں۔

باب (۲۶)

اُمّت

مفہوم۔

اُمّت کے لغوی معنی مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) زندگی کا طریقہ یا راستہ

(۲) ایک نسل یا پشت

(۳) حیوانی نوع یا حیوانات کا گروہ

(۴) خاندان

(۵) مُلک

(۶) جماعت یا قوم خواہ عقیدوں کے لحاظ سے مختلف ہوں۔ ایسی جماعت کے سامنے نبی دعوت پیش کرے۔ تو اسے اُمت دعوت کہتے ہیں۔

(۷) نبی کے پیرو۔ اسے اُمّت اجابت کہتے ہیں۔

اس وقت ہمارے عنوان کا مفہوم آخری معنی کے اعتبار سے ہے یعنی جناب نبی آخرالزماں وختم المرسلین حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکاروں کی جماعت۔ اسے اُمّت محمدیہ یا اُمّت مسلمہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اُمّت مسلمہ ایک وسیع اور عالمگیر ادارہ ہے۔ بچے سے لیکر بوڑھے تک ہر مسلمان اس کا رکن ہے۔

تمام ارکان کو اس میں برابر کی اہمیت حاصل ہے ہو سکتا ہے کہ ایک اَن پڑھ اور نادار شخص جو ظاہر بیں آنکھ کو حقیر نظر آتا ہے۔ کل جہاد کے موقعہ پر کوئی ایسی خدمت انجام دی جائے جو بڑے بڑے عہدہ دار کے حصّے میں بھی نہ آئی ہو۔

شرائطِ رُکنیت۔

(۱) دُنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سب مسلمان امت مسلمہ کے رُکن ہیں اس رُکنیت کے لئے کوئی رسمی فارم بھرنے یا چندہ جمع کرنے کی ضرورت نہیں صرف اسی قدر کافی ہے کہ آدمی زبان سے کلمہ شہادت ادا کر دے۔

(۲) ہر وہ بچہ بھی اُمت مسلمہ کا فرد ہوتا ہے جو اس اُمت میں پیدا ہو۔ اگرچہ غیر مسلموں کے بچے بھی اس وقت تک مسلمان ہوتے ہیں جب تک ان کے والدین انہیں غیر مسلم نہ بنالیں لیکن فقہی اعتبار سے ان کا شمار اُمت کے افراد میں نہیں ہوتا۔

(۳) کلمہ شہادت انسان کو اُمت مسلمہ میں فوراً داخل کر دیتا ہے۔ بشرطیکہ وہ کسی اسلامی عقیدہ سے انکار نہ کرے ہم کسی کا سینہ چیر کر اس کی نیت کا بھید نہیں کھول سکتے اس لئے اگر کوئی شخص دھوکے سے مُسلمان بن جائے تو ہمارے لئے یہ فیصلہ ناممکن ہوتا ہے کہ وہ منافق ہے اسے اس وقت تک دائرہ اسلام سے خارج نہیں سمجھا جا سکتا جب تک وہ علانیہ اسلام کے کسی بنیادی اصول کا منکر نہ ہو جائے۔ ایسے شخص کے اعمال بہت فاسقانہ بھی ہوں تو زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس کے اعمال منافقوں کے سے ہیں اس پر منافقت کا حکم نہیں لگ سکتا۔ اس کی بداعمالیوں سے بیزاری اور لاتعلقی کا اظہار ہو سکتا ہے۔ اسے اُمت مسلمہ کے حقوق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔

ایک صحابی حضرت مقداد بن الاسود نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ اگر میدانِ جنگ میں کسی کافر سے میرا سامنا ہو جائے اور وہ تلوار کے وار سے میرا ہاتھ کاٹ ڈالے۔ پھر کسی درخت کی اوٹ میں پناہ لیکر کہہ دے کہ میں مُسلمان ہو گیا ہوں تو کیا میں اسے قتل کر سکتا ہوں؟ حضُور نے

فرمایا اسے مت مار و مقداد نے عرض کی کہ جناب پہلے اس نے میرا ہاتھ کاٹا اور پھر اسلام کا اظہار کر دیا کیا اسے قتل نہ کر دوں۔ فرمایا اسے قتل نہ کر اگر تو نے اسے قتل کر دیا تو اس کے قتل سے پہلے جو تیری منزلت تھی وہ اس کی ہو جائیگی، اور اس کے کفر کا درجہ تجھے مل جائے گا۔

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک لشکر میں روانہ فرمایا ہم دشمن قبیلہ پر حملہ آور ہوئے میں ایک شخص کے سر پر پہنچا تو اس نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہہ دیا تاہم میں نے ایک برچھی ماری لیکن میرے دل میں شبہہ بیٹھ گیا۔ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا حضورؐ نے فرمایا کیا اس کے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہنے کے باوصف تو نے اسے مار ڈالا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس نے محض اسلحہ کے خوف سے کلمہ پڑھا تھا۔ حضورؐ نے فرمایا کیا تو نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا۔ کہ اس کے دل سے یہ آواز اٹھی تھی یا نہیں حضورؐ نے یہ فقرہ بار بار دہرایا، میری یہ حالت ہو گئی کہ میں نے چاہا کاش میں آج ہی مسلمان ہوا ہوتا۔

(۳) اُمت اسلامیہ کی رکنیت کا دروازہ ہر ایک کے لئے ہر وقت کھلا ہے تو نسلی یا جغرافیائی تفرقوں سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا ہر رکن اس عالمگیر ادارہ کی رکنیت سے بہرہ اندوز ہوتا ہے۔ اہلیت ہو تو ایک سیاہ فام حبشی بھی خلافت پر فائز ہو سکتا ہے۔

(۴) اُمت کا کوئی عہدہ یا منصب متوارث نہیں ہوتا۔ علم و روحانیت کو بھی کسی ایک خاندان میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام میں برہمنوں کی طرح کوئی ایسا طبقہ نہیں جو علم یا روحانیت کو اپنے لئے مخصوص کرے۔ اس اُمت میں شودروں کی طرح کوئی ناپاک ذات نہیں۔ ہر مومن پاکیزہ ہوتا ہے۔

شعار:-

اُمت محمدیہ کو دیگر امتوں سے ممیز کرنے کے لئے اور اس کی باہمی شناخت کے لئے علامتیں مقرر ہیں۔ ایسی علامت کو شعار کہتے ہیں، شعار کا مقصد صرف نشان دہی نہیں

بلکہ ملی حمیت. درشن وشکوہ کا اظہار بھی ہے۔
مسلمان جب آپس میں ملتے ہیں تو ملاقات کی ابتدا السلام علیکم سے ہوتی ہے
یہ بھی شعار ہے۔

اسی طرح مسجد بھی شعار ہے جہاں چار گھر بھی مسلمانوں کے ہوں گے وہاں
مسجد نہایت ضروری ہو گی کیونکہ یہ ایک ایسا شعار ہے جو کسی حالت میں نظر انداز
نہیں کیا جا سکتا جس محلہ یا گلی میں یا حطہ میں کوئی مسجد ہو گی وہ اس بات کی گواہی
دیگی کہ یہاں چند گھر مسلمانوں کے آباد ہیں۔

اسی طرح اور بھی بہت سی علامتیں ہیں۔ قرآنِ پاک میں مسلمانوں کا ایک شعار یہ
بھی قرار دیا گیا ہے۔ کہ اِن لوگوں کی پیشانیوں پر سجدوں کے نشان بہت واضح ہیں جبین
پیشانی پر سیاہ سا نشان ہو گا، وہ یقیناً سجدے کی علامت ہو گی یہ نشان اسی وقت
پیشانی پر واضح طور پر اُبھرتا ہے۔ جب اس شخص کو نماز کی مستقل عادت ہو گی۔ اور
نماز باقاعدگی سے ادا کرتا ہو گا۔

پھر حدیثوں میں اہلِ اسلام کے لباس میں چند ضروری ہدایات موجود ہیں یعنی
مرد کا لباس ایسا ہو جس سے ناف سے لیکر گھٹنے تک بدن ڈھکا ہوا ہو۔ اگر گھٹنے
برہنہ ہوں تو یہ بات شعار اسلام کے خلاف ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی شعار اسلام
میں ہے کہ ٹخنے ننگے ہوں۔
یعنی ایسا لباس جس سے ٹخنے ڈھانکے جائیں منع ہیں۔

سیاسی تفریق۔

اہلِ اسلام مختلف حکومتوں اور سلطنتوں میں پھیلے ہوتے ہیں اس اختلاف کی وجہ سے
اُمّت مسلمہ کے گروہوں میں کچھ سیاسی تفریق رونما ہو جاتی ہے ہر حکومت کے جداگانہ
قواعد اور قوانین ہوتے ہیں ان قواعد اور قوانین کا فرق اُمّت میں کوئی بنیادی
فرق تو پیدا نہیں کر سکتا۔ لیکن ہر الگ ریاست کے مسلمانوں کی ایک لحاظ سے الگ
سیاسی روش قائم ہو جاتی ہے۔ وہ کچھ ایسے معاہدات پر مجبور ہوتے ہیں کہ ہر حال

میں دوسری حکومت کے مسلمان بھائی کی فوری مدد کو نہیں پہونچ سکتے ۔
سورہ انفال کے آخری رکوع سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں جہاں تک
دینی معاملات کا تعلق ہے ۔ مدد میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے ۔ لیکن باقی امور میں
امداد نہیں ہو سکتی ۔

حقوق وز النفس ۔

اُمت مسلم کے باہم برادرانہ حقوق ہیں اسے ہم اخوت کا جامعہ نام دیتے ہیں اس پر
مکمل بحث آئندہ صفحات میں آئے گی ۔

اُمت کی قوت جس قدر زیادہ ہو وہ اعداء کی یورش سے اسی قدر مامون
اس لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے ۔ جیسے اتفاق و اتحاد کہتے ہیں ۔ اور اس غرض کے
حصول کے لئے مندرجہ ذیل ذرائع استعمال کرنے ناگزیر ہیں ۔ ذرائع مندرجہ ذیل ہیں ۔

اخوت ۔ تبلیغ ۔ جہاد

آئندہ صفحات میں ان عنوانات پر الگ الگ بحث کی جائے گی ۔

باب (۲۷)

اُخُوّت

مفہوم:۔ اُخوّت کے معنی ہیں برادری عربی میں اَخ بھائی کو کہتے ہیں۔ اس کے مفہوم میں سگے بھائی کے علاوہ رشتہ کا بھائی خاندان کا رکن ہم مذہب ہم قوم ہم قبیلہ ہم پیشہ اور دوست بھی شامل ہیں۔

اہمیت:۔
قرآن حکیم میں ارشاد ہے۔
اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔
فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔
مسلمان مسلمان کا بھائی ہے وہ اس کی خیانت نہیں کرتا اس سے جھوٹ نہیں بولتا اور نہ بُرے وقت پر اس کے کنارہ کشی کرتا ہے۔ ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون مال اور عزت آبرو حرام ہے۔
حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ نے ایک لاکھ سے زاید صحابہؓ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔
اے لوگو میری بات سنو اور سمجھو۔ جان لو کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ سب اہل اسلام کی ایک برادری ہے کسی شخص پر اس کے بھائی کا مال حلال نہیں جب تک وہ اپنی خوشی سے نہ دے ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔

حدیث میں ہے۔ کہ مسلمان آپس میں ایک عمارت کی مثال ہیں۔ جس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو مضبوط کرتا ہے۔ مسلمان باہمی مروت رحمت اور شفقت میں ایک جسم کی مانند ہیں ایک عضو بیمار ہو تو کل جسم بے خواب اور بخار زدہ ہو جاتا ہے۔

اسلامی اخوت کا رشتہ ناقابل شکست ہے۔ کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ اگر کوئی مسلمان اسے توڑنا چاہے تو وہ احاطہ اسلام سے ہی خارج ہو جاتا ہے۔ مسلمان کو قطعاً روا نہیں کہ اپنی جماعت کو چھوڑ کر اغیار سے قلبی روابط قائم کرے ثقافتی ہم آہنگی اور کسی قسم کا اشتراک قائم کرے۔ یا پاک سویت یا پاک جاپان یا پاک جرمن سوسائٹیاں بنائے۔

قرآن پاک میں صریح الفاظ میں اس ذہنیت کی مخالفت کی گئی ہے۔ فرمایا
لَا تَتَّخِذِ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ (یعنی مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں سے موالات اور اتحاد یا کوئی باہم اشتراک ہرگز جائز نہیں مسلمانوں کی موالات یعنی قلبی محبت اور رفاقت فقط اللہ تعالےٰ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کی جماعت سے ہو سکتی ہے۔ دیگر اقوام سے دنیاوی راہ و رسم رکھنے کی اجازت ہے ان کے ساتھ شرافت اور صداقت سے پیش آنے کا حکم ہے۔ مگر ان سے مسلمانوں کا سا ربط و ضبط قائم نہیں ہو سکتا۔ جو ٹوٹ ہی نہ سکے۔ صاحب ایمان شخص کی دنیا فقط اللہ تعالےٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کے لئے وقف رہتی ہے۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ مہر و محبت سے رہتا ہے۔ قرآن حکیم کا مسلمانوں کے بارے میں ارشاد ہے۔
اَشِدَّاۗءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ۔ یعنی مسلمان کافروں کے معاملے میں سخت رویہ رکھتے ہیں۔ لیکن آپس میں رحمدلی اور مروت کے پیکر ہوتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ مرد مومن کی صفت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

خلوص :-

اخوت کا اصل الاصول خلوص یا نیک نیتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بد صحابہ کرام

سے ارشاد فرمایا کہ دین خلوص کا نام ہے۔ صحابہ نے عرض کی خلوص کس کے لیۓ ہو۔ فرمایا۔ اللہ کے لیۓ مسلمانوں کے اماموں کے لیۓ اور ان کے عوام کے لیۓ۔

جذبۂ اخوت کی تقویت۔

ہر مسلمان کو لازم ہے کہ وہ دیگر مسلمانوں کے ساتھ برادرانہ تعلقات رکھے۔ اور ان سے میل جول اور راہ و رسم بڑھاتا رہے۔ جناب ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلہ میں کچھ واضح ہدایت دی ہیں۔ مثلاً ایک حدیث میں ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان کے تعلقات کے بارے میں ارشاد ہے۔

۱۔ ملاقات کے وقت سلام کرے۔

۲۔ وہ دعوت پر بلائے تو اس کی دعوت قبول کرے۔

۳۔ بیمار ہو تو اس کی بیمار پرسی کرے۔

۴۔ مر جائے تو جنازہ میں شرکت کرے۔

۵۔ تحفہ تحائف دیتا رہے۔

مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

جب کوئی آدمی کسی مریض کی عیادت کو جاتا ہے یا اپنے کسی بھائی کے پاس اللہ کی خوشنودی کے لیۓ جاتا ہے۔ تو ایک آواز دینے والا آواز دیتا ہے کہ تو بھی مرغوب ہے اور تیرا چلنا پھرنا بھی مرغوب ہے۔ تو نے جنت میں اپنا گھر بنالیا۔

نااتفاقی کی ممانعت۔

مسلمانوں کو دوسرے مسلمان سے بگاڑ پیدا کرنے کی اجازت نہیں حدیث شریف میں ارشاد نبوی ہے کہ کسی مسلمان کے لیۓ حلال نہیں کہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ تک قطع کلامی یا قطع تعلق رکھے۔

جس قوم میں اتحاد نہ ہو وہ ضعف کا شکار ہو جاتی ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ۔

اور آپس میں لڑائی جھگڑا نہ کرو ورنہ تم کمزور ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائیگی

غیر مسلموں سے بارہا تعلقات ٹوٹ جاتے ہیں اور بعض دفعہ جنگ کی نوبت بھی آجاتی ہے۔ لیکن مسلمانوں کو آپس میں لڑنے جھگڑنے کا خیال بھی نہیں آنا چاہئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے کہ مسلمان کو گالی دینا فسق اور اس کو قتل کرنا کفر ہے نیز فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ و مامون رہیں۔

پھر فرمایا۔

آپس میں حسد نہ کرو محض دوسرے کو زک دینے کے لئے نیلام میں قیمت نہ بڑھاؤ۔ آپس میں بغض نہ رکھو، ایک دوسرے سے منہ نہ موڑو، ایک دوسرے کے سودے پر سودا نہ کرو اے اللہ کے بندو بھائی بھائی بن جاؤ۔ مزید فرمایا۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ اس پر ظلم کرتا ہے نہ اس کا ساتھ چھوڑتا ہے اور نہ اسے حقیر جانتا ہے۔ آپؐ نے تین بار اپنے سینے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا تقویٰ یہاں ہے۔ ایک مرد کا اتنا ہی کام بڑے شر کا باعث ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے بھائی کو حقیر جانے، ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون مال اور آبرو حرام ہے۔

ارشاد نبوی ہے کہ مسلمان کے لئے حلال نہیں کہ اپنے مسلمان بھائی کی طرف ایسی نگاہ سے اشارہ بھی کرے جس سے وہ رنجیدہ ہو۔

باہمی حقوق

اہل اسلام کے ایک دوسرے پر بیشمار حقوق ہیں ان کی بجا آوری اس خوش قسمت انسان کو ہی نصیب ہو سکتی ہے جسے اللہ تعالےٰ نے سچا ایمان عطا کیا ہو۔ مختصر طور پر ان حقوق کا مطالعہ مندرجہ ذیل عنوانوں کے ماتحت کیا جاتا ہے۔

۱۔ مسلمان کی مکمل خیر خواہی اور اعانت۔

۲۔ اپنی ذات پر ترجیح۔

۳۔ اس کے حق میں اچھا بولنا۔

۴۔ ہر حال میں جماعت سے وابستگی

ذیل میں ان عنوانوں پر الگ الگ بحث ہو گی۔

مسلمان کی مکمل خیر خواہی اور اعانت

رہبر کامل صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

تم میں سے کوئی آدمی اس وقت تک کامل مومن نہیں ہوتا جب تک وہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے بھی وہی بھلائی نہ چاہے جو وہ اپنے لئے چاہتا ہے۔

ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر مختصراً یہ حق ہے کہ اس کا دل اور اس کی زبان اس کی خیر خواہ ہو اور ضرورت پڑنے پر ہر جانی اور مالی ایثار کے لئے تیار ہو جائے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ نے مومنین سے ان کی جانیں اور ان کے اموال جنت کے عوض خرید لئے ہیں۔ اس کا یہی مطلب ہے کہ مومن کو اللہ کی عبادت اور اس کے بندوں کی خدمت کے لئے ہر وقت آمادہ رہنا چاہیے اسلام نے بے شک اپنے پیروکاروں سے یہ توقع رکھتا ہے۔ کہ وہ سب بنی نوع انسان کی بھلائی کے لئے مستعد رہیں لیکن جو مقام درخصوصیت اپنے مسلمان بھائیوں کے حقوق کی ہے اسے اور کوئی کس طرح پہنچ سکتا ہے۔

ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ اس پر ظلم نہیں کرتا اور نہ مشکل میں اس کا ساتھ چھوڑتا ہے جو شخص اپنے بھائی کا مددگار ہو اللہ تعالےٰ اس کا کارساز رہتا ہے۔

جو شخص اپنے بھائی سے ایک دکھ دور کرتا ہے اللہ تعالےٰ قیامت میں اس سے ایک کرب دور کر دے گا۔

جو شخص دنیا میں کسی کی عیب پوشی کرے گا اللہ تعالےٰ قیامت کے دن اس کی ستر پوشی کریں گے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد اہلِ مدینہ کے باہمی حقوق اور ذمہ داریوں کی ایک مختصر مگر بنیادی فہرست مرتب فرمائی تھی اس میں مسلمانوں کے باہمی تعلقات کا خصوصیت سے ذکر ہے ان کے تعلقات سے متعلق مندرجہ ذیل

فرائض عاید کئے گئے تھے۔

۱۔ مسلمان کے قلبی رفیق صرف مسلمان ہوں گے۔

۲۔ ایمان والوں کے دوست دشمن مشترکہ ہوں گے۔ کوئی مسلمان اسلام کے دشمن سے تنہا مصالحت نہیں کر سکتا۔

۳۔ اہل ایمان مقروض مسلمانوں کی مدد کریں گے۔

۴۔ اگر مسلمانوں میں سے کوئی شخص ظلم سرکشی یا بغاوت کا مرتکب ہوگا تو سب پرہیزگار مسلمان اس کے خلاف متحد ہو کر اٹھ کھڑے ہونگے۔

آخری شرط کا تعلق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے ہے۔

مسلمان بھائی سے خیر خواہی صرف دنیوی معاملات زندگی کے دکھ سکھ تک محدود نہیں بلکہ آخرت کی تیاری میں بھی اس کی مدد کرنی چاہیئے۔ اسلام نیک بننے اور بنانے کا حکم دیتا ہے۔ برائی کی روک تھام اور نیکی کی اشاعت ہو تو اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے۔ کہ جماعت کی خرابیاں، کمزوریاں دور ہو جاتی ہیں۔ اور اس کی قوت بڑھتی ہے۔ قرآن حکیم نے ہر مسلمان کے لئے حسب استطاعت

اَلْاَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ اور نَہْیٌ عَنِ الْمُنْکَرِ (نیکی کا حکم اور برائی سے منع کرنا) ایک ضروری فریضہ قرار دیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لوگوں کے درمیان اصلاح کرنا (نفل) نماز روزہ اور زکوٰۃ سے افضل ہے۔

انسان خود مدد کرنے سے قاصر ہو تو کسی اور کو ہی اس کی سفارش کر دے ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صدقہ زبان سے بڑھ کر اور کوئی صدقہ نہیں عرض کیا گیا کہ کیسے فرمایا ایسی سفارش جس سے تو خون ریزی روک سکے۔ ایک دوسرے سے فائدہ دلوائے اور کسی سے ناپسندیدہ چیز کو دور رکھے۔

زبانی صدقہ کا ایک طریقہ یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے آگے مسلمان کی بھلائی کی دعا کی جائے۔ چونکہ اس دعا میں خلوص ہوتا ہے اس لئے اسے شرف قبولیت عطا ہو جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کوئی دعا اتنی سرعت سے قبول نہیں

ہوتی، جتنی کہ غائبانہ دُعا۔
کسی مسلمان میں کوئی عیب نظر آئے تو اُسے نہایت احتیاط سے خلوت میں آگاہ کر دینا چاہیئے۔ تاکہ وہ اسے دور کر دے کسی مسلمان کو یہ جائز نہیں کہ اسے خامی سے آگاہ کیا جائے تو بُرا مانے۔

۱۔ اپنی ذات پر ترجیح

مسلمان کو اپنے اسلامی بھائیوں کی ہر مدد کے لیئے تیار رہنا چاہیئے۔ یہاں تک کہ ضرورت پڑے تو جان بھی لڑا دے۔
ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک صحابی کو ایک بھیڑ کی سری تحفۃً پیش کی گئی انہوں نے فرمایا میرا فلاں بھائی مجھ سے زیادہ حاجت مند ہے۔ اسے بھیجی گئی تو اس نے یہی بات ایک اور کے متعلق کہی اور اسے بھجوانے کو کہا۔ اس طرح یہی سری سات آدمیوں سے ہوکر پہلے آدمی کے پاس ہی لوٹ آئی۔
مسلمان بھائی کو اپنی ذات پر ترجیح دینے کی ایک درخشاں مثال مؤاخات کی ہے۔ مُسلمانوں میں باہمی ایثار و محبت پیدا کرنے اور اخوت کی روح بیدار کرنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان میں وقتاً فوقتاً مواخات یعنی بھائی چارہ کرا دیتے تھے یعنی دو مُسلمانوں سے ارشاد فرما دیتے۔ کہ تم آپس میں بھائی ہو، ان میں حقیقی بھائیوں کی طرح حقوق اور واجبات قائم ہو جاتے تھے، آپ نے مکی زندگی میں ہی مواخات کرادی تھی لیکن ہجرت کے بعد اس کی نئے سرے سے ضرورت پیدا ہوئی۔ مہاجرین بے خانماں تھے انہیں امداد کی ضرورت تھی ہجرت کے چند ماہ بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کو اکٹھا کیا ایک ایک مہاجر کو بلا کر ان میں مواخات کرادی۔
انصار نے اپنے مواخاتی بھائیوں کے ساتھ نہایت ایثار کا سلوک کیا اور ان کا جان و مال سے ہاتھ بٹایا، اس کی وضاحت فقط ایک مثال سے ہی ہو جاتی ہے۔ ایک انصاری سعد بن الربیعؓ نامی تھے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ ان کے بھائی قرار دیے گئے تھے

حضرت سعدؓ انہیں گھر لے گئے اور تمام اثاثہ نصف نصف بانٹ دینا چاہا۔ حتیٰ کہ کہا کہ میری دو بیویاں ہیں میں ایک بیوی کو طلاق دیتا ہوں۔ آپ اس سے نکاح کر لیں۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کی بلند ہمتی دیکھئے کہ انہوں نے اس ایثار کو شکریہ کے ساتھ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور حضرت سعدؓ سے کہا کہ مجھے بازار کا راستہ بتا دو جب انہیں بازار کا راستہ دکھا دیا گیا تو آپؓ نے وہاں مکھن اور گھی کی تجارت شروع کر دی۔ آپؓ کے کاروبار نے یہاں تک ترقی کی کہ آپ مدینہ منورہ کے نامی گرامی تاجروں میں شمار ہونے لگے۔

انصار نے مہاجرینؓ کو آدھے نخلستان دینے کی پیش کش کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تجویز نہ مانی اور فیصلہ ہوا کہ مہاجرین نصف پیداوار پر زمینوں پر کام کرینگے۔ جب تک ہجرت جاری تھی مؤاخات کا سلسلہ قائم رہا جو کہ نیا مہاجر آتے یا کوئی صاحب حلقہ اسلام میں داخل ہوتے انصار ان کو بھائی بنانے کے لئے جھگڑتے اور قرعہ اندازی سے فیصلہ ہوتا۔

اسلامی مؤاخات کو حقیقی اخوت پر بھی غلبہ حاصل تھا۔ آغاز میں مواخات کی ایک شرط یہ تھی کہ مواخاتی بھائی کے انتقال کے بعد بجائے حقیقی بھائی کے مواخاتی بھائی وارث ٹھہرتا تھا۔ کچھ مدت کے بعد جب مہاجرین اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے اور انہیں زیادہ اعانت کی حاجت نہ رہی تو وراثت کا یہ قاعدہ منسوخ ہو گیا۔

٣- مسلمان بھائی کے حق میں اچھا بولنا یا اچھی گواہی دینا۔

اگر کوئی مسلمان دیکھے کہ کسی مسلمان کے خلاف ناحق تہمت تراشی ہو رہی ہے یا کسی کا حق مارا جا رہا ہے تو دیکھنے والا مسلمان چپکا نہ ہو رہے بلکہ اس کو بچائے اور اعانت کرے۔ آبرو انسان کی سب سے قیمتی متاع ہے۔ مسلمان کی آبرو کو ناحق کی تہمتوں اور افترا پردازی سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے۔

٤- ہر حال میں جماعت کے ساتھ وابستگی

سچے مسلمان کے دل میں یہ پختہ احساس ہوتا ہے۔ کہ وہ جماعت کا ایک مستقل رکن ہے

اس کی زندگی جماعت کی زندگی سے الگ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ وہ ملت کے نفع و نقصان اور مسرت و رنج میں برابر کا شریک ہے۔ اسے کسی وقت جماعت کی بہبود اور ترقی سے غافل نہ رہنا چاہیئے۔ قوم وقتی طور پر زوال کی زد میں بھی آجائے تو اس سے مایوس ہو کر اوروں کی طرف راغب نہ ہو بلکہ اس کے مستقبل کو سنوارنے کے لئے اپنی زندگی وقف کر دے۔

علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے۔

ملت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

جماعتی خوشحالی اور آبرومندی کا یہی راز ہے کہ اس کے افراد آپس میں وابستہ رہیں کوئی شخص دل برداشتہ ہو کر اس کا ساتھ چھوڑے حضرت یونس علیہ السلام اللہ کے پیغمبر تھے وہ اپنی ہٹ دھرم قوم سے بددل ہو کر اللہ کے حکم کا انتظار کئے بغیر شہر سے نکل گئے اللہ کو حضرت یونسؑ کا یہ اقدام پسند نہ آیا۔ اور تنبیہ کے لئے انہیں انہیں مچھلی کے پیٹ میں پہنچا دیا حالانکہ حضرت یونسؑ کا ناقابل اصلاح قوم سے الگ ہو جانا کوئی گناہ کی بات نہ تھی انہوں نے اپنے خیال کے مطابق ایک ٹھیک فیصلہ کیا تھا۔ لیکن اللہ تعالےٰ کو یہ بتانا مقصود تھا۔ کہ آپ قوم کا ساتھ نہ چھوڑتے تو زیادہ بہتر تھا۔ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا کہ تین چیزوں پر مسلمانوں کا دل خیانت نہیں کرتا۔ اطاعت الہٰی کا اخلاص۔ ائمہ مسلمین سے خلوص اور جماعت سے وابستگی۔

آپ کا ایک اور ارشاد ہے کہ جو شخص اپنی جماعت سے ایک بالشت بھر بھی جدا ہوا اور اسی حالت میں مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا یعنی کافر ہو کر مرا۔

باب (۲۸)

تبلیغ

مفہوم :-

تبلیغ کے معنی ہیں انتہا یا آخری ٹھکانے تک پہنچانا۔ محاورہ میں کہتے ہیں۔
بَلَغَ مِنِّی کَلَامُکَ یعنی تیرے کلام نے مجھ پر بہت اثر ڈالا۔
اسی طرح تَبَالَغَ فِیْہِ الْمَرَضُ اس کا مرض انتہائی شدت کو پہنچا۔
دینی اصطلاح میں تبلیغ سے مراد اللہ تعالیٰ کے پیغام کو وضاحت کے ساتھ دوسروں تک پہنچانا۔ قرآن مجید میں اسے بلاغ بھی کہا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور قرآنی اصطلاح بلاغ مبین بھی ہے بلاغ اور بلاغ مبین بہت حد تک ہم معنی ہیں لیکن بلاغ مبین صلی اللہ علیہ وسلم سے مختص ہے۔ کیونکہ وہی اس کا پورا حق ادا کر سکتے ہیں۔
قرآن حکیم میں تبلیغ کے لئے ابلاغ کا لفظ بھی آیا ہے۔
تبلیغ غیر مسلم کو بھی ہو سکتی ہے اور مسلم کو بھی جہاں غیر مسلم کے کان میں اسلام کا پیغام پہنچانا ضروری ہے وہاں مسلمانوں کو بھی برائیوں سے پرہیز کرنے اور نیکی کی طرف زیادہ سے زیادہ میلان بڑھانے کے لئے تبلیغ کی ضرورت رہتی ہے۔

اہمیت -

مولینا حسین احمد مدنیؒ تبلیغ کی اہمیت پر اظہار خیال کرتے تحریر فرماتے ہیں۔
دُنیا کے سب عُقلا کا اس پر اِتفاق ہے کہ ہر انسان کا اخلاقی اور انسانی فرض ہے کہ

اگر کسی دوسرے انسان کو کسی سخت نقصان سے دوچار ہوتا ہوا دیکھے تو اس کی مدد کرے اور حتی الوسع اس کی دستگیری کرتا ہوا مصائب و آفات کے پنجہ سے نجات دلوائے۔ ان بنا پر گڑھوں اور کنوؤں میں گرنے والوں درندوں اور زہریلے جانوروں کا شکار ہونے والوں ظالم اور خون خوار حیوانوں کے پنجوں میں پھنسنے والوں فاقہ فقراء اور امراض میں مبتلا ہونے والوں تمام انسانوں کی مدد ہر مذہب میں ضروری خیال کی جاتی ہے۔

جبکہ دنیا کی چند روزہ مصائب اور فنا ہونے والے جسم کی تکالیف سے بچانا انسانی فریضہ شمار کیا جاتا ہے تو اخروی دائمی مصائب اور ہمیشہ باقی رہنے والی روح کو تکالیف سے بچانا کیا اس سے بدرجہا لازم فریضہ شمار نہیں کیا جائے گا۔

اس لئے ہر انسان کا فرض ہے کہ دوسرے انسانوں کی اخروی زندگی اور روحانی امراض سے شفایابی کی طرف پوری توجہ دے۔

اسلام روحانی ہی نہیں مادی فلاح کا بھی ضامن ہے۔ اس لئے ہر عہد میں اسلامی تبلیغ کی ضرورت رہی ہے۔ آج جب کہ دنیا میں روحانی تنزل اور مادی پریشانی کے اسباب اس قدر عام ہیں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ اسلام کی صحیح فطری اور ہر زمانہ میں قابل عمل تعلیمات کو دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ موجودہ دنیا کو جس قدر روگ لگے ہوئے ہیں ان کی شفایابی قرآن حکیم اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہے۔ اس امانت کے امانت داروں کو اپنی مقدس امانت کی اشاعت کے فریضہ سے سبکدوش ہونا گویا امانت کا صحیح استعمال کرنا ہے اس لئے اس کا حق ادا کرنا فرض عین ہے۔

آج دنیا بھر کے سربراہ عالمی برادری کے طلب گار ہیں اور پکار رہے ہیں کہ جب تک عالمگیر پیمانہ پر ایک اخوت قائم نہیں ہوتی ہمارے دکھوں کا علاج نہیں ہو سکتا۔ اب یہ ثابت کرنا مسلمانوں کا کام ہے کہ اسلام نے اس برادری کو آج سے چودہ سو سال پہلے ہی قائم کر کے دکھا دیا ہے کہ وہ برادری جس میں کالے گورے شرقی غربی اور امیر غریب کی کوئی تمیز نہیں اس کے دروازے ہر انسان پر کھلے ہیں۔

تبلیغ اسلام کی ضرورت اس لئے نہیں کہ اس میں دُنیا والوں کا فائدہ ہے بلکہ اس لئے بھی ہے کہ اس میں ہر مسلمان کی بہتری ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے گھر میں صفائی کا خوب اہتمام کرے اور پورے محلے میں عفونت اور گندگی پھیلی ہو تو وہ کس طرح بدبو اور جراثیم کی یورش سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ اردگرد کی انسانیت بُرائیوں میں لتھڑی ہو تو اسی سے نیک آدمی بھی نقصان اٹھائیں گے اس لئے جو آدمی نیکی سے پورا مستفیض ہونا چاہتا ہے اُسے چاہئے کہ اپنے ماحول سے بُرائی کو دور کرے اور نیکی کی اشاعت کرے۔

وَالْعَصْرِ۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ۔ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔

زمانہ گواہ ہے یقیناً انسان نقصان اٹھانے والا ہے۔ مگر وہ لوگ مستثنےٰ ہیں جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے اور انہوں نے ایک دوسرے کو حق کی تلقین کی اور صبر یعنی استقلال اختیار کیا۔

اس سورت کے مطالعہ اور اس پر غور کرنے سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اگر نیکی کی تبلیغ رُک جائے تو قوم خسران یعنی شدید قسم کے نقصان میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ نیکی ٹھیراؤ اور سکون کا نام نہیں۔ یہ حرکت اور پیہم حرکت کا نام ہے، اگر اس میں وسعت اور ہمہ جہتی پھیلاؤ پیدا نہ کیا جائے تو اس کی نشوونما ختم ہو جاتی ہے اور یہ جلد یا بدیر ختم ہو جاتی ہے۔

اسلام کی نگاہ میں کاملاً اور حقیقتہً نیک وہ ہے جو اوروں کو بھی نیک بنانے کی تڑپ رکھتا ہو۔ جو نیکی اپنے ہی اندر گم ہو اور اس کی روشنی اردگرد نہ پھیل رہی ہو عین ممکن ہے وہ محض فریب ہو، مقید یا لولی لنگڑی نیکی جو انسانیت کی خدمت سے قاصر ہو اس کا ہونا اور نہ ہونا برابر ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔

نیکی کی اشاعت سے پہلے ضروری ہے کہ اسے بدی کی یورشوں سے محفوظ کر دیا جائے۔ جب تک بُرائی کا انسداد نہ ہو نیکی کی اشاعت مشکل ہے اس لئے اسلام میں بُرائی کو

روکنے اور نیکی کو رائج کرنے کا ساتھ ساتھ حکم ہے۔ اسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہتے ہیں۔ یعنی نیکی کی طرف حکم کرنا اور برائی سے بچانا اس لحاظ سے تبلیغ کے دو جزو ہیں نیکی کی اشاعت اور برائی کی رکاوٹ۔

ہر مسلمان اسلام کا مبلغ ہوتا ہے اس کو مقدور بھر اسلام کی تبلیغ کرنی چاہیئے۔ جب تک قوم میں برائی کو روکنے والے افراد ہوتے ہیں۔ اس میں ترقی کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ملت میں تبلیغ وارشاد اور تعلیم و تزکیہ کے فرائض انجام دینے والے گروہ کا وجود از بس ضروری ہے۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہے۔

وَلْتَكُنْ مِنكُمْ اُمَّةٌ يَدْعُونَ اِلَى الخَيرِ وَيَامُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ المُنكَرِ۔ وَاُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۔

تم میں سے ایک جماعت ہمیشہ ایسی موجود ہونی چاہیئے کہ جو لوگوں کو نیکی کی طرف دعوت دے اچھے کاموں کے کرنے کو کہے اور برے کاموں سے روکے اور اسی قسم کے لوگ نجات پائیں گے۔

ہادیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے تمہیں اچھی باتوں کا حکم دینا ہے اور برے کاموں سے روکنا ہے۔ ورنہ عین ممکن ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ تم پر عذاب بھیج دے پھر تم اسے پکارو گے تو کوئی جواب نہیں ملے گا۔

ملت کی ذمہ داریاں اجتماعی ہیں۔ ہم فقط اپنی اصلاح کر کے یہ ایک فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ فرد کی ہستی ملت سے وابستہ ہے۔ وہ اس کے خیر و شر میں حصہ دار ہوتا ہے۔

اخلاق میں متعدی تاثیر ہوتی ہے اچھے اخلاق کو دیکھکر دل میں نیکی کا رجحان ہوتا ہے۔ اور برے اخلاق والوں کے ہاتھوں اور لوگ بھی برائیوں میں پڑ سکتے ہیں۔ اگر برائی کا قوت اور استقامت سے مقابلہ نہ کیا جائے تو اس کا دائرۂ اثر نہایت تیزی سے

پھیلنے لگتا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارک ہے کہ بنی اسرائیل میں جب خرابی واقع ہوئی تو یوں کہ جب کوئی اسرائیلی اپنے بھائی کو گناہ کرتے دیکھتا تو اسے منع کرتا تھا۔ پھر دوسرا دن آتا تو نہ روکتا۔ اس لئے کہ وہ خود اس کا ہم نوالہ و ہم پیالہ ہو جاتا تھا پس اللہ تعالے نے ان دونوں کے دلوں کو آپس میں خلط ملط کر دیا اور ان کے بارے میں لعن الذین کفر وا من بنی اسرائیل سے فاسقون۔ تک قرآن پاک کی آیات نازل ہوئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تکیہ سے ٹیک لگائے ہوئے تھے یہ آیات پڑھکر بیٹھ گئے اور صحابہ سے فرمایا تم برائی کے انسداد سے ہرگز نہ رکنا۔ حتیٰ کہ ظالم کا ہاتھ پکڑ لو اور اُسے حق کی طرف جھکا دو۔

سورۃ والعصر میں صراحت سے بتایا گیا ہے کہ صرف خود نیک بننے سے اسلام کا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔ جب تک کہ دوسرے لوگوں کو بھی نیک بنانے اور نیکی پر ثابت قدم رکھنے کی کوشش نہ کی جائے۔ برائی کے وبائی جراثیم کو گردوپیش سے ختم کرنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں جس قدر کوشش ہو سکے کرنی چاہیئے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بتاتی ہے کہ اگر کسی کو کوئی برا کام کرتے دیکھو تو پہلے اُسے طاقت سے روکو اگر ایسا نہ کر سکو تو زبان سے روکو اگر ایسا بھی نہ کر سکو تو دل میں ضرور اسے برا سمجھو اور یہ تیسرا درجہ کمزور ترین ایمان کا ہے۔ کامل ترین درجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں اتنی طاقت ہو کہ دست و بازو سے برائی کا استیصال کر سکیں۔

تبلیغ اسلام کا حکم

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے۔

بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً

مجھ سے سن کر آگے پہنچا دو اگرچہ ایک آیت ہی ہو۔

حجۃ الوداع کے خطبہ میں آپ نے فرمایا

اللہ تعالے اُس شخص کو ہمیشہ خوش رکھے جو میری حدیث کو سن کر اشاعت کے لئے

اذبر کرتا ہے۔ میرے خطبہ کو سُننے والا اسے غیر موجود آدمیوں تک پہنچ ئے۔
حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام حتی الوسع جنگ سے گریز فرماتے تھے اگر کسی وجہ سے
آپ جنگ پر مجبور ہو جاتے تو آخر دم تک اُسے ٹالنے کی کوشش کرتے اور دشمن کو
اسلام کی دعوت دیتے تھے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہ جنگ خیبر میں یہود کے خلاف معرکہ آرائی کے لئے روانہ
ہوئے جناب ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا
میں اس وقت تک تلوار چلاؤں کہ وہ ہماری راہ پر آجائیں۔ حضورؐ نے فرمایا علیؓ
وقار و سکون کے ساتھ جا جب ان کے مقابل ہو تو انہیں اسلام کی دعوت دے اور
اللہ کے حقوق بتا۔ اللہ کی قسم شخص واحد کا تیرے ہاتھ پر اسلام قبول کرنا سرخ اونٹوں
سے زیادہ قابل قدر ہے۔

جناب ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر چیز سے زیادہ تبلیغ عزیز ہوتی تھی تبلیغ
کی خاطر آپؐ نے نہایت فراخ دلی سے بڑے دُکھ اٹھائے۔

قرآن حکیم کا ارشاد ہے۔
كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ
عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ۔

تم سب امتوں میں سے بہترین اُمت ہو جو لوگوں کے لئے انہیں راہ راست پر لانے
کے لئے بھیجے گئے ہو تم لوگوں کو اچھے کاموں کے کرنے کا حکم دو اور بُری باتوں
سے منع کرو اور اللہ پر ایمان لاؤ۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اُمت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے دُنیا
میں بھیجے جانے کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ لوگوں پر حکومت کرے اور لوگوں کو بُرائی
سے بچا کر نیک اور فلاح والے راستے پر چلائے۔

تبلیغ کے طریقے :- تبلیغ اسلام کے دو طریقے ہیں :
(۱) زبانی ہدایت (۲) اخلاقی کشش۔

زبانی ہدایت۔

زبانی تبلیغ صبر و تحمل اور حُسنِ کلام سے ہونی چاہیئے جسے مخاطب کیا جائے وہ ضروری نہیں کہ ہدایت کو فوراً قبول کر لے۔ ہر آدمی کو اپنے عقائد و اعمال اچھے نظر آتے ہیں۔ بار بار وہ تبلیغ کو اپنے عقائد و نظریات میں دخل اندازی سمجھ کر بھڑک اُٹھتا ہے اس لئے انتہائی سکون کا مظاہرہ کرنا چاہیئے۔

زبان سے ایسا کوئی لفظ نہ نکل جائے جو اُلٹا فساد پیدا کرے۔

ارشاد باری تعالےٰ ہے۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ط كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ۔

اور تم بُرا بھلا نہ کہو ان بتوں کو جن کو مشرک لوگ حاجت روا سمجھ کر اللہ کے سوا پکارتے ہیں۔ اس طرح وہ اللہ کو بُرا بھلا کہنے لگیں گے نادانی سے۔ اسی طرح ہم نے مزین کر دیے ہیں ہر اُمت یا گروہ کے لیے اُس کے عمل۔

یعنی ان کو اپنے اعمال اور اپنے معبود ہی اچھے ہیں اگر تم بُرائی سے ان کے بتوں کو یاد کرو گے تو اس کے جواب میں وہ حق تعالےٰ کو اپنی نادانی سے بُرا کہنے لگیں گے۔

ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالےٰ ہے۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ۔

انہیں حکمت اور اچھے کلام کے ساتھ اپنے رب کے راستے کی طرف بلا۔
اور بہترین بات سے ان سے مباحثہ کر۔

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اس آیت کی نہایت دل آویز شرح لکھی ہے۔ جو ذیل میں درج ہے۔

اس آیت میں جناب نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تعلیم دی جا رہی ہے کہ لوگوں کو راہ پر کس طرح لایا جائے اس کے تین طریقے بتائے۔

حکمت :- موعظۃ حسنۃ اور جادلہم بالتی ھی احسن

(۱) حکمت سے مراد یہ ہے کہ نہایت پختہ اور اٹل مضامین دلائل و براہین کی روشنی میں ایسے انداز سے پیش کئے جائیں، جن کو سن کر فہم و ادراک اور علمی ذوق رکھنے والا طبقہ سر جھکا دے۔

(۲) مواعظ حسنہ سے مراد مؤثر اور رقت انگیز نصیحتیں ہیں جن میں نرم خوئی اور دل سوزی کی روح بھری ہوئی ہو۔ اخلاص۔ ہمدردی۔ شفقت اور حسن اخلاق سے خوبصورت اور معتدل پیرایہ میں جو نصیحت کی جاتی ہے اس سے بسا اوقات پتھر کے دل بھی موم ہو جاتے ہیں اور مردوں میں جانیں پڑ جاتی ہیں۔ بالخصوص وہ لوگ جو زیادہ عالی دماغ اور ذکی و فہیم نہیں ہوتے مگر طلب حق کی چنگاری سینے میں رکھتے ہیں۔ ان میں مؤثر پند و موعظت سے عمل کی ایسی روح بھری جا سکتی ہے جو بڑی اونچی عالمانہ تحقیقات سے ممکن نہیں۔

(۳) دنیا میں ایسی جماعت بھی ہمیشہ رہی ہے جس کا کام ہر چیز میں الجھنا اور بات بات میں حجتیں نکالنا اور کج بحثی کرنا ہے۔ یہ لوگ نہ حکمت کی باتیں قبول کرتے ہیں نہ وعظ و نصیحت قبول کرتے ہیں۔ بلکہ چاہتے ہیں کہ ہر معاملہ میں بحث مناظرہ کا بازار گرم رہے۔

بعض اوقات اہل فہم و انصاف اور طالبین حق کو بھی سب کچھ ریتے ہیں اور بحث کے بغیر تسلی نہیں پاتے اس لئے جادلہم بالتی ھی احسن فرمایا کہ اگر ایسا موقع آ جائے تو بہترین طریقہ سے بحث کرو خواہ مخواہ دل آزار اور جگر خراش باتیں مت کرو جن سے قضیہ بڑھے اور معاملہ طول کھینچے۔ مقصود افہام و تفہیم اور احقاق حق ہوتا ہے۔ خشونت بد اخلاقی سخن پروری سے کچھ نتیجہ نہیں نکلے گا۔

کسی قوم یا ملت کو تبلیغ کرنے سے پہلے یہ اچھی طرح دیکھنا چاہئے کہ کیا اس کو اسلام سے کسی بات میں اتفاق بھی ہے یا نہیں۔ دونوں ملتوں میں جس قدر مشترکہ باتیں نظر آئیں سب سے پہلے ان سے ابتدا کرنی چاہئے۔ تاکہ سننے والا ایک بار توجہ سے اسلام کی صدا پر کان لگائے اس کے بعد آہستہ آہستہ اخلاقی امور کو چھونا چاہیے۔ لیکن اس انداز کے ساتھ کہ کوئی رنجش پیدا نہ ہونے پائے۔

اہل کتاب کا دعویٰ ہے کہ ہم توحید کے علم بردار ہیں قرآن حکیم اس دعوے کی

بنیادپران سے آغازِ سخن کرتا ہے۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ

اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیجئے اہل کتاب سے کہ آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے تمہارے درمیان برابر ہے۔ کہ ہم صرف اللہ کی عبادت کریں۔ اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں۔ اور آپس میں ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب نہ مانیں۔

اخلاقی کشش۔

اس شخص کا کلام دل پر اثر کرتا ہے۔ جو اپنے قول پر عمل پیرا بھی ہو گفتار کے غازی کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ تبلیغ کا کلام ہزار شیریں ہو، لیکن اس کا اخلاق دلاویز نہ ہو۔ تو وہ اثر نہیں کرتا۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم کا جو پیغام سنایا اور خود جس بات کی تلقین فرمائی اس پر خود عمل کر کے بھی دکھایا۔ آپ قرآن مجسم تھے آپ نے اپنی حیات مبارکہ کا ایک ایک گوشہ نگاہ عالم کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ تاکہ کوئی یہ نہ کہے۔ کہ شاید زندگی کا فلاں گوشہ جو ہماری نگاہوں سے اوجھل رہ گیا ہے اس میں (نعوذ باللہ) کوئی خامی یا عیب ہو۔ بڑے بڑے اعدا بھی آپ کے اخلاقی اعجاز کے سامنے مہر بلب رہ جاتے تھے۔ ابوجہل ایسا کینہ پرور دشمن بھی آپ کے اخلاقی کمال کا معترف تھا۔

اشاعت اسلام کی تاریخ دیکھئے تو معلوم ہوگا تو معلوم ہوگا۔ کہ تبلیغ کا کارنامہ زبانی پند سے زیادہ عملی تاثیر کا مرہون منت تھا۔ مرکت اسلامیہ کا کردار رحمت خداوندی کی جھلک دکھاتا تھا۔ فاتح افواج جہاں جہاں پہنچیں وہاں کے باشندے ان کے حسن اخلاق سے مسحور ہو کر اسلام کے حلقہ بگوش ہوتے گئے۔ یہ حالت صدیوں رہی۔ خلافت راشدہ کے ایام پر نگاہ ڈالئے اموی دور کا تصور کو ذہن کے سامنے لائیے اور غور کیجئے کہ وہ کیا مبارک دور تھا کہ بحر اوقیانوس سے انڈونیشیا تک ایک عالم اسلامی عساکر اور افراد کے دل نواز کردار کا فریفتہ ہو کر دین اسلام کا دل و جان سے پیرو

ہو گیا تھا۔ آج پھر اسی حسنِ عمل کی ضرورت ہے۔

یوں تو ہر مسلمان کو جامع فضائل ہونا چاہیئے لیکن غیر مسلموں کے مقابل اس میں خصوصیت سے صبر و تحمل، عفو و درگزر، جیسے خصائل لازم ہیں تاکہ وہ اس کی سیرت کے اسیر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ فرمان خداوندی ہے۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ آمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ أَيَّامَ اللّٰهِ۔

اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اہلِ ایمان سے کہہ دیجئے کہ وہ ان سے درگذر کریں۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝

نیکی اور بدی میں برابری نہیں ہو سکتی آپ بہتر چیز سے بدلہ دیا کریں پھر آپ دیکھیں گے کہ وہ شخص جس میں اور تم میں دشمنی ہے اس طرح ہو جائے گا گویا کہ بڑا گرم جوش دوست ہوتا ہے۔

اور پھر ایک اور جگہ باری تعالٰے فرماتے ہیں۔

وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ۝

اور اگر مشرکین میں سے کوئی تمہارے پاس امن کی تلاش میں آجائے تو تم سے ضرور پناہ دے دیا کرو یہاں تک کہ وہ تمہارے ہاں سے اللہ تعالٰے کا کلام سُنے پھر اس کے بعد اسے امن کی جگہ پہنچا دو۔

حضرت علیؓ کی عدل پروری کو دیکھ کر ایک یہودی کے اسلام قبول کرنے کا واقعہ بیان ہو چکا ہے۔

ایران کا ایک آتش پرست حاکم حضرت عمرؓ کے ایفائے عہد اور آپ کی سادگی کو دیکھکر مسلمان ہو گیا تھا۔ اسلام کی تاریخ ایسے ان گنت واقعات سے پُر ہے۔ اگر اہلِ اسلام میں اخلاق کی کمی ہو تو وہ لوگ جو قرآن حکیم اور اسلامی اصول سے

متنفر ہو کر اسلام کی طرف مائل ہوں گے وہ بھی قدم روک لیں گے۔ سورہ نحل میں اہل اسلام سے ارشاد ہے کہ اپنی قسموں کو اپنے درمیان حیلہ نہ بناؤ اگر تم ایسا کرو گے تو جما ہوا قدم بھی اکھڑ جائے گا۔

مراد یہ ہے کہ تمہاری بدعہدی اور دروغ گوئی کو دیکھ کر اس کا قدم ڈگمگا جائے گا۔

قرآن حکیم نے نومسلموں کی دلداری اور تالیف قلوب کی بہت تاکید کی ہے اور بیت المال سے ان پر خرچ کرنے کا حکم دیا ہے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم مؤلفۃ قلوب یعنی نومسلموں کی بہت دل جوئی کرتے اور ان کو بڑے بڑے عطیے دیتے تھے۔ اور ان پر بہت نوازش کرتے تھے۔ حضرت صفوان بن امیہ حالت شرک میں آنحضرت کے جانی دشمن تھے ان کا بیان ہے کہ حضورؐ نے مجھے حنین کی غنیمت میں سے مال غنیمت دیا تھا اور اس کے بعد بھی بخشش کرتے رہے۔ آپؐ مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہو گئے۔

تبدیلیٔ مذہب میں جبر نہیں۔

اسلام میں اس بات کی قطعاً اجازت نہیں کہ کسی کو جبراً مسلمان بنایا جائے قرآن حکیم کا اعلان ہے

لَا اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ

دین کے معاملہ میں کوئی جبر یا مجبوری نہیں۔

مسلمانوں کا کام فقط اتنا ہے۔ کہ وہ اسلام کو نہایت وضاحت کے ساتھ اور احسن طریقہ سے دنیا کے سامنے پیش کر دے بزور شمشیر کسی کو اسلام قبول نہیں کرا سکتا۔

ایک اور جگہ ارشاد خداوندی ہے۔

فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ۔

اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو ہدایت یافتہ ہو جائیں گے اور اگر وہ منہ پھیر لیں تو آپؐ کا کام تو صرف تبلیغ اسلام ہے۔

اسلام جبر و اکراہ سے نہیں پھیلا کیونکہ ہر زمانے میں اسلامی مجاہدین اور

عساکر اسلامیہ کے سامنے قرآن پاک یہ بین آیات رہیں اور ان پر وہ بخوبی عامل رہے۔
اس سلسلہ میں صوفیا اور صلحائے اسلام مشائخ عزام نے تبلیغ اسلام میں عساکر اور
مجاہدین اسلام سے بڑھ کر سرگرمیاں دکھائیں اور اخلاق کی تلوار سے اسلام کا مجسم
نمونہ بن کر اعدائے اسلام کے دلوں میں گھر کر لیا۔ انہیں کی مساعی حسنہ سے
اسلام اقصائے عالم میں چھپ گیا۔

ایک وقت تھا کہ تاتاری کفار نے اسلام کے مرکز بغداد کو تباہ و برباد کر دیا تھا انہوں
نے آخری خلیفہ اسلام مستعصم باللہ کو قتل کر دیا اور گویا اپنی دانست میں اسلام
کو ختم کر دیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان وحشیوں اور جنگلیوں کو بھی اسلام کی
فطری تعلیمات سے مسحور کرنے کا موقعہ فراہم کیا فتح بغداد کے کچھ ہی عرصہ بعد
تاتاری جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے اور بعد میں اسلام کی بہت عظیم خدمات
انجام دیں۔

چین انڈونیشیا اور ایسے ملکوں میں جہاں عساکر اسلام کے قدم بھی نہ گئے تھے
آج کروڑوں مسلمان آباد ہیں۔

یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اسلام کی حقانیت اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتی ہے۔
اور یہ کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا لیکن اس کے باوجود ہم کو مغربی مصنفین
یہی بتاتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا گیا۔

اور یہ کہ مجاہدین اسلام کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار ہوا کرتی تھی۔
اور لطف یہ ہے کہ ان کے اس ناپاک پروپیگنڈا سے ہمارا اعلم دوست طبقہ بھی متاثر
ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اور ان میں بہت سے لوگوں کا یہی خیال ہے کہ واقعی اسلام
جبر و تشدد سے پھیلایا گیا ہے۔

اگر بفرض محال یہ مان بھی لیا جائے کہ ہمارے بزرگوں کو ان مجاہدین نے جبراً مسلمان
کیا تھا جو ہمارے ملک میں فاتحانہ حیثیت سے آئے تھے۔ اور وہ دل سے مسلمان
نہ تھے تو بھی ہم ان مجاہدین کے ممنون ہیں جنہوں نے اشاعت اسلام میں اس قدر

کوشش کی تھی کہ اگر وہ نہیں تو آج ہم اور ہمارے بھائی تو صدقِ دل سے اسلام پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کی کوششوں سے اتنے وسیع پیمانے پر اسلام کی اشاعت ہوئی کہ یہ دینِ فطرت اپنی پوری شان سے پھیل گیا۔ اور آج ہم انہی کی کوششوں سے پاکستان بنانے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ لیکن یہ مغربی مفکرین اور مصنفین اور مورخین کی ہمیشہ سے یہی کوشش ہوتی ہے کہ اسلام اور مشاہیرِ اسلام اور سلاطینِ اسلام کے کردار کو دھندلا کر کے نہایت مکروہ شکل میں پیش کریں۔

ان مفکرین کی تعصب کا یہ عالم ہے کہ جہاد جو کہ صرف جہد للبقا کی صورت ہے۔ اور جس کا وجود ہر قوم کے لئے اہم ہے اس کو مکروہ شکل میں پیش کریں اور دنیا کے سامنے اسلام اور مشاہیرِ اسلام میں نقص نکالیں اور عیب جوئی اور الزام تراشی کے انبار لگائیں۔ اب جہاد کے بیان میں پوری شرح و بسط سے اس کی غرض و غایت واضح کی جائے گی۔

باب (۲۹)

جہاد

مفہوم :- جہاد کے لغوی معنی ہیں جد و جہد یا کوشش کرنا۔

جہاد فکری، قولی، عملی اور مالی ہر طرح سے ہو سکتا ہے۔ علوم و دانش میں غور و فکر کی کاوشیں دعوت الی الحق میں زبان و قلم کی مشغولیت۔ میدان عمل میں جان و بدن کی محنت کوشیاں اور مال و متاع کی قربانیاں سب جہاد میں شمار ہوتی ہیں۔

جہاد اپنے اندر معنی و مفہوم کی ایک وسیع دنیا سمو رکھتا ہے۔ جہاد کی پکار کبھی جان و تن کی حفاظت کا تقاضا کرتی ہے اور کبھی جان راہِ خدا میں لُٹا دینے کا اشارہ کرتی ہے۔ کبھی اولاد و اقرباء کی خدمت گذاری کا حکم دیتی ہے کبھی خدا کی خاطر ان سے بے نیاز ہو جانے کی طالب ہوتی ہے۔ الغرض اللہ تعالےٰ کی رضا جوئی کا دوسرا نام ہے۔ خدا کی راہ میں زندگی وقف کر دینا اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس کے ہر حکم کے تابع ہو جانا جہاد ہے۔ یہی اسلام اور یہی ایمان ہے۔ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے کہ کون ہے جو اپنے آپ کو رضائے الٰہی کی قیمت کے عوض بیچ دیتا ہے۔ ایک اور مقام پر اہلِ اسلام کو حکم ہے کہ اللہ تعالےٰ کے احکام کی تعمیل میں محنت کا حق ادا کرو" زندگی کا ایک ایک ثانیہ جہاد ہے بشرطیکہ زندگی کو نیک مقاصد کے تابع کر دیا جائے مثلاً ایک طالب علم کے سامنے اگر فقط یہی مقصد ہو کہ وہ علم و ہنر میں کمال حاصل کر کے اپنی اور اپنے خاندان کی ترقی کا باعث ہوگا۔ اور بس تو اس کی شبانہ روز کی عرق ریزی چاہے اسے دنیوی ترقی کی معراج تک

پہنچا رہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی کام گاریاں مستحسن نہیں ہونگی اور اگر وہ اپنی طالب علمانہ مساعی کو خدا تعالیٰ کی رضا اور قوم کی فلاح کا ایک ذریعہ سمجھے تو حصولِ علم میں اس کی ایک جنبش بھی جہاد میں شمار ہو گی۔

جہاد کی وسعت ساری دُنیا پر محیط ہے۔ قرآن کا ایک ایک حرف اور ہادیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ایک اِشارہ جہادِ زندگی کی تلقین کرتا ہے۔ مگر اصطلاحی معنوں میں جہاد سے مُراد حق کے دفاع کے لئے ظاہر و پوشیدہ دشمن کے مقابلے پر تیاری یا جنگ ہے۔

جہاد اور حرب میں فرق

جہاد اور عام جنگ میں بہت فرق ہے۔ جنگ ایک مطلق لفظ ہے اگر اس پر نیکی انسانیت اور شرافت کی پابندیاں لگادی جائیں۔ تو اسے جہاد کہا جائے گا۔ اسلام سے قبل عرب میں جنگ کے لئے حرب کا لفظ مستعمل تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ نے اس لفظ کو کراہت کی نگاہ سے دیکھا کیونکہ اس کے ساتھ عرب کی مدتِ مدید کی سنگ دلانہ اور وحشیانہ روایات وابستہ تھیں۔ آپ نے عربوں کو جہاد کے لفظ سے روشناس کرایا۔ جہاد وہ جنگ ہے جو خدا کی راہ میں نیکی کی حفاظت کے لئے انتہائی مجبوری کی حالت میں لڑی جاتے۔ اگر اس سے تجاوز ہوا ور ظلم و زیادتی کو راہ دی جائے تو یہ جہاد نہ رہے گا۔ بلکہ اسے حرب کہیں گے۔ اسلام سے قبل عربوں کی خون آشام طبیعت کو لفظ حرب سے اتنی محبت تھی کہ بعض افراد کا نام بھی حرب رکھا جاتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نام رکھنے سے منع فرمایا۔ حرب کے لفظ کو عربی لغت سے مٹانا مشکل تھا اُسے باقی رہنے دیا گیا۔ اور بعد میں اسلامی جنگوں کے لئے اسے بھی استعمال کیا گیا۔ مگر اصطلاحی لفظ بہر حال جہاد ہی ہے۔

اہمیت۔

اس دار و گیر اور تنازع للبقا کی زندگی میں جد و جہد سے کنارہ کشی ناممکن ہے۔ کائنات کا کارخانہ تضاد اور مسابقت کے اصول پر چل رہا ہے۔ عناصر در طبائع میں ازل سے آویزش اور مسابقت جاری ہے۔ نیکی اور بدی کی جنگ اور زوال سے بعض کت

چلی آتی ہے۔
اس کی آنچ کبھی ٹھنڈی ہوئی نہ ہو گی۔ حق و باطل دو متقابل قوتیں ہیں انہوں نے ایک دوسرے کو دبانے اور مغلوب کرنے کی کوشش کی ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفویؐ سے شرار بولہبی (اقبالؒ)

حق و باطل کی جنگ میں حق کو یہ امتیاز رہا ہے کہ اس نے ہمیشہ بچاؤ کا پہلو اختیار کیا ہے۔ اگرچہ نیکی بجائے خود بدی کی حریف ہے مگر بدی پر نیکی نے ازخود کبھی حملہ نہیں کیا۔ نیکی نام ہی اس وصف کا ہے کہ کسی کے خلاف اقدام نہ کیا جائے۔ مگر ادھر بدی کی روح یہ ہے کہ دوسروں کو ستایا جائے۔ اور جو چیز اس کے بُرے ارادوں کی راہ میں حائل ہو اسے تباہ کر دیا جائے۔ اسی لئے وہ ہمیشہ نیکی پر حملہ آور ہوتی رہتی ہے۔ ادھر نیکی بھی ایک قوت ہے۔ ضعف یا عدم وجود کا نام نہیں اس لئے زور دکھا کر سامنے آتی ہے۔ اور تصادم ہو جاتا ہے یہی عمل اور رد عمل کا سلسلہ ہمیشہ سے چلتا رہا ہے۔
ہر قوت کے لئے ایک متخالف قوت اور ہر قوم کے لئے ایک نہ ایک حریف قوم ضرور ہوتی ہے۔ مسلمان اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں انہیں بھی روز اول سے بدخواہوں بدباطنوں اور کھلے اور چھپے ہوئے دشمنوں سے سابقہ پڑا ہے اسی لئے اللہ تعالےٰ نے قرآن حکیم میں انہیں کیل کانٹے سے لیس رہنے کا حکم دیا ہے۔
دشمن کی دشمنی ضروری نہیں کہ کھلے بندوں ہی ہو دشمن دو قسم کے ہوتے ہیں یعنی ظاہر اور پوشیدہ جن اعداء کی عداوت ظاہر ہو ان کے خلاف تو حفاظت کی تدابیر لازم ہیں مگر ان دشمنوں سے بھی حذر کرنا چاہیئے جن کی عداوت ان کے دلوں میں پوشیدہ ہے۔ وہ کسی وقت بھی گھات سے نکل کر دھاوا بول سکتے ہیں۔ ان کے اچانک حملوں سے محفوظ رہنے کے لئے ضروری ہے کہ حسب استطاعت قوت فراہم کی جائے۔ سرحدوں کو مضبوط رکھا جائے۔ اور قوت و شوکت کی وہ نمود ہو کہ دشمن کو قدم بڑھانے کا حوصلہ ہی نہ پڑے۔

دنیا میں امن کے قیام کے لئے جہاد از بس ضروری ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔
لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِيْنَ۔ اگر اللہ تعالےٰ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے باز نہ رکھتا تو ضرور زمین میں فساد برپا ہو جاتا۔ لیکن اللہ تعالےٰ فضل و کرم والا ہے۔ سب جہانوں کے لئے۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ جہاد اللہ تعالےٰ کی رحمت کا بہانہ ہے۔
جہاد فرض کفایہ ہے اور اعلیٰ ترین عبادات میں سے ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالےٰ کی راہ میں ایک دن محاذ جنگ پر گذارنا دنیا و ما فیہا سے بہتر ہے۔

جہاد کن حالات کی ضرورت ہے۔

اہل اسلام کا اولین ہتھیار صلح ہے۔ قرآن حکیم کی تعلیم ہے کہ کوئی لاکھ بدخواہ اور زحمت رساں ہو۔ اس سے حتی الوسع درگذر کیا جائے اس کی مخالفتوں سے چشم پوشی کی جائے۔ اور اس کی برائی کو حسن سلوک سے شرمسار کیا جائے۔
صلح دعوت اسلام کا نقطۂ سر آغاز ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو صلح کی فضا پیدا کرنے کے لئے کوشاں رہنا چاہئے۔ مگر جب کہ سورۂ بقر کے پہلے دو رکوع سے خوب واضح ہوتا ہے دنیا میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو نہ صلح کی آواز سننا چاہتے ہیں اور نہ نیکی کی صدا سے متاثر ہوتے ہیں۔ ان کے دل پتھر سے زیادہ سخت ہیں۔ اور ان پر کفر و عصیان کے دبیز پردے پڑے ہیں اور ایک پردہ نہیں ان پردوں کا شمار ہی نہیں کیا جا سکتا۔ فساد ان کا مایہ خمیر ہے۔ وہ شیطنت سے کبھی باز نہیں آتے۔
اللہ تعالےٰ نے قرآن پاک میں جا بجا فرمایا ہے کہ اگر ایسے لوگوں پر شر انگیزی حد سے تجاوز کر جائے تو پیار کا جواب دو اور ان کی فتنہ پردازیوں کا مکمل سدباب کرو۔
مندرجہ ذیل صورتوں میں سے جب کوئی صورت پیش آ جائے تو دشمن سے جنگ آزما ہونا ہی پڑتا ہے۔

(۱) دشمن اسلامی ملک پر حملہ آور ہو (جیسا کہ ۱۹۶۵ء میں ہندوستان کی کافر حکومت نے بغیر اعلان جنگ کے اسلامی ملک پاکستان پر حملہ کر دیا تھا)

۲۔ دشمن اہل اسلام کو ظلم و ستم کا نشانہ بنائے۔

۳۔ دشمن لوگوں کو راہ خدا پر چلنے سے روکے یا دین اور مذہب پر پابندیاں عاید کرے۔

۴۔ دشمن غیر مسلم لوگوں پر بھی ناروا پابندیاں لگائے تو اس صورت میں بھی ایک مسلمان اس کے خلاف جہاد کر سکتا ہے۔ لیکن یہ جہاد کی یہی صورت ہوگی جس میں دیکھا جائے گا کہ دنیا میں کہیں مسلمانوں پر ناروا ظلم و زیادتی نہیں ہو رہی اگر دنیا میں ہر جگہ مسلمان عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہے ہوں انہیں کسی غیر مسلم سے کسی قسم کا خطرہ نہ ہو (جو ایک امر محال ہے) تو اس صورت میں اس چوتھی شق پر عمل کرتے ہوئے غیر مسلم لوگوں کے دین کی حمایت میں جہاد کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ دشمن شکست عہد یا غداری کا مرتکب ہو۔ یا اس کی منافقت ظاہر ہو جائے۔

۶۔ دشمن فتنہ و فساد پیدا کرے یا بالواسطہ فتنہ فساد کا باعث ہو۔

مذکورہ بالا صورتوں میں کوئی صورت پیش آجائے تو ظاہر ہے کہ یہ اسلام اور اہل اسلام کے لئے ایک خطرہ ہوگا۔

اس کا انسداد نہ کیا جائے تو مسلمان مٹ کر رہ جائیں گے۔ مسلمانوں کی خیریت اسی میں ہے کہ وہ مل کر فتنہ پرور قوتوں کے خلاف جنگ کریں۔ اس جنگ میں ہی ان کے لئے زندگی کا سامان ہے۔

مسلمانوں کو ہرگز قطعاً اجازت نہیں کہ دنیاوی اغراض کے لئے خون بہاتے پھریں۔ یا اسلام کے علاوہ کسی اور نظریے کی تائید میں خون ریزی کا موجب بنیں اس صورت میں ان کی موت یا شہادت کی موت نہ ہوگی ان کی زندگی کا مالک صرف اللہ ہے اس لئے غیر اللہ کی خوشنودی ایک مسلمان کی زندگی کا تاریک ترین پہلو ہوگا۔ اور یہ شرک کی ضمن میں شمار کیا جائے گا۔ اللہ تعالےٰ کو ایک مسلمان کی ذات سے یہ توقع ہے کہ صرف اسلامی حقانیت کی خاطر اور باطل اور طاغوتی طاقتوں سے انکار کرتے ہوئے

اپنی جان کو پیش کرے۔

اسلام کے مجاہدین جب بھی میدان جہاد میں نکلتے حق کی مدافعت کے لئے سورہ انفال کی چوتھی آیت میں اللہ تعالےٰ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صاف ارشاد ہے کہ میں نے آپ کو امر حق میں مدینہ سے نکال کر مشرکوں کے مقابلہ پر روانہ کیا۔

جہاد کی پکار کا کس طرح جواب دیا جائے۔

(۱) حق کے لئے سینہ سپر ہونا اہل اسلام کا فرض اولین ہے۔ جب حالات سے ظاہر ہو کہ اب اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بنائے ہوئے اصول کے مطابق میدان جنگ کی طرف چند ناگزیر ہے تو توقف نہ کرو یہ گویا اللہ اور رسولؐ کی پکار ہے جس کا جواب لازم ہے۔

(۲) اولاد کی محبت اور نقصان جان و مال کا اندیشہ قطعاً راہ میں حائل نہ ہوں ایسے موقعوں پر اولاد اور مال کی محبت آزمائش بن کر سامنے آتی ہے۔ اس آزمائش میں جو ناکام ہو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

(۳) اگر دشمن ملک پر چڑھائی کردے تو اپنی قلت اور دشمن کی کثرت کو نہ دیکھو۔ بارہا قلیل فوجیں کثیر افواج پر غالب آچکیں ہیں تم نیکی کے جذبہ کو لے کر اٹھو گے تو کوئی وجہ نہیں کہ فتح تمہارا ساتھ نہ دے۔ تمہاری اس فتح سے جیسا کہ بدر کی جنگ میں ثابت ہوا۔ اللہ تعالےٰ دو کام لے گا۔

ایک تو دنیا پر واضح ہو جائے گا کہ حق ظاہر طور پر کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو بالآخر فتح یاب ہوتا ہے۔ یہ ثبوت حق کی ایک کھلی دلیل ہو گی۔ اور دوسرے یہ فتح تمہارے لئے خدا کی نعمتوں کے دروازے کھول دے گی

ہمیں جنگ بدر اور اس سے پہلے کے واقعات سے ایک نہایت بصیرت افروز سبق ملتا ہے جب مسلمان مکہ میں تھے تو تعداد میں کم اور سامان میں کم تر تھے مشرک انہیں ذرا بھی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اور بے اعتنائی برتتے تھے اور انہیں طرح طرح کے مصائب میں مبتلا کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں گویا گوناگوں منصوبے

باندھتے تھے کبھی قید کبھی قتل اور کبھی جلا وطنی کی تجویزیں ہوتی تھیں۔ مگر اللہ تعالے نے ایسی تدبیر کی کہ ان کی ساری چالیں اکارت گئیں۔ مسلمانوں کے لئے اللہ تعالے نے مدینہ منورہ کو قرارگاہ بنایا جس میں دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے پائیدار قوت پیدا کر لی۔ مشرک انہیں بھی نہ دیکھ سکے اور مکہ سے ایک بڑا لشکر لے کر چلے تاکہ مدینہ کے مسلمانوں کو ختم کر دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی مٹھی بھر فوج کے ساتھ دارالہجرت یعنی مدینہ سے روانہ ہوئے۔ اہل اسلام کی بے سروسامانی کا یہ حال تھا کہ گویا جانتے بوجھتے ہلاکت کے منہ میں جا رہے تھے۔ مگر اللہ تعالے نے ان کی مدد کی دشمنوں کے دل میں ان کا رعب ڈال دیا۔ فرشتوں کی کمک بھیجی جنگ کی سکون شکن فضا میں انہیں پرسکون نیند دی اور آسمان سے بارش نازل فرمائی۔ جب فوجوں کی ٹکر ہوئی تو دشمن کی فوج میں ابتری اور انتشار پھیل گیا ان کے کشتوں کے پشتے لگ گئے ان کے سر پکے ہوئے پھل کی طرح کٹ کٹ کر گرنے لگے۔

اور باقی ماندہ فوج نے راہ فرار اختیار کر لی۔ مسلمانوں نے اور ان کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا پہلے ہی معرکہ میں حق کو باطل پر شاندار کامیابی ہوئی۔ اور کفار کے دل میں مسلمانوں کی حقارت اور کمتری اور نفرت کے جو جذبات تھے ان میں اعتدال پیدا ہونا شروع ہو گیا۔

جنگ بدر کے بعد اور کئی جنگیں پیش آئیں، اور ان میں سے تقریباً سب کی سب مسلمانوں کی کامیابی اور فتح پر منتج ہوئیں۔ کیا ان بین مثالوں کے ہوتے ہوئے بھی انہیں یہ حق پہنچتا ہے کہ بزدلی دکھائیں۔ نہیں ہرگز نہیں۔ ایک مسلمان کا دل اور غیر اللہ کا خوف، انہونی سی بات ہے۔

اللہ تعالے فرماتے ہیں کہ ایک دل میں اللہ اور غیر اللہ کے خوف جمع نہیں ہو سکتے۔ ان دو میں سے فقط ایک کو انتخاب کرنا ہو گا۔ مومن کے دل میں ہر وقت اللہ کا خوف رہتا اور اس کی آیات سن کر اس کا دل دہل جاتا ہے۔ وہ ماسوا خدا کے اور کسی سے نہیں ڈرتا۔ اللہ کا واضح حکم ہے کہ جنگ میں بزدلی نہ دکھاؤ۔ بزدلوں پر اللہ کا غضب ہو گا۔

بغیر جنگی ضرورت کے جنگ میں منہ پھیر کر بھاگنے کی کوشش کرنا حرام ہے۔ بزدلی کو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے غداری قرار دیا گیا ہے۔

فتح کے اسباب :-

جنگ کثرت نفوس سے نہیں جیتی جاتی۔ اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے مندرجہ ذیل احکام ہیں۔

(۱) اللہ کو بہت یاد کرو۔

(۲) اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام مانو اور ان سے منہ نہ موڑو۔ اخلاق نیک رکھو اگر پرہیزگار ہو گے تو اللہ تمہارے لئے نمایاں امتیاز قائم کر دے گا۔ عبادت کرو اور خیانت سے بچو۔

۳- کامیابی پر پھول نہ جاؤ غرور کا سر نیچا ہوتا ہے۔ مکہ کے مشرک جنگِ بدر کے لئے بڑے فخر و ناز کی چال سے گھروں سے نکلے کہ جاتے ہی مسلمانوں کو برباد کر دیں گے، انہیں اپنی طاقت پر بڑا گھمنڈ تھا۔ ان کے شیطانی دل کہتے تھے کہ آج ہمیں کون جیت سکتا ہے۔ مگر مسلمانوں کے مقابل ہوئے تو چند گھڑیوں میں ہوش و حواس کھو بیٹھے۔

۴- ثابت قدم رہو۔ جس فوج میں صبر و ثبات ہو۔ وہ اپنے سے دس گنا لشکر کو زیر کر لیتی ہے اور اگر بہت بے سر و سامان بھی ہو تو بھی کم از کم دو گنے لشکر کو شکست دے سکتی ہے۔

۵- متحد رہو نا اتفاقی کو اپنی صفوں میں ہرگز گھسنے نہ دو اگر تم میں اتفاق رہا تو تمہاری کامیابی یقینی ہے۔ لیکن انتشار اور بدنظمی کی صورت میں اور اختلاف کی حالت میں تمہاری ہوا اکھڑ جائیگی۔ تم بے رعب ہو جاؤ گے۔ جنگ بدر کے موقع پر اس جنگ میں کامیابی اور فتح سے ہمکنار ہونے پر اللہ تعالے نے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان جتایا ہے کہ میں نے تمہارے دلوں میں محبت پیدا کر دی ہے حالانکہ اس سے پہلے تم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ساری دُنیا کے خزانے بھی خرچ کر ڈالتے تو تم میں باہم محبت پیدا نہ کر سکتے۔

اس اتحاد نے مسلمانوں کو دشمن پر فتح دلوائی۔

سورہ انفال کے مطالعہ سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ جہاد کی پکار ہو تو مندرجہ بالا اصول کو سامنے رکھ کر جنگ میں بے خطر کود پڑنا چاہیئے۔ جہاں مسلمان صلح کے تمام طریقے آزما چکیں اور بالآخر تلوار کو نیام سے باہر نکالنا ہی پڑے تو بے جگری اور دلیری سے لڑیں اور دشمن کا بند بند کاٹ دیں۔

جب تک دشمن ہتھیار نہ ڈالے بازار قتال کی گرمی بڑھاتے رہیں فساد کے کارندے اچھی طرح ملیامیٹ ہو جائیں تو جبھی فتنوں سے باز آئیں گے۔

مسلمان اس وقت تک لڑتے رہیں جب تک دشمن فتنہ سے باز نہ آ جائے۔ اور مذہبی امور سے خود ساختہ پابندیاں نہ اٹھالے۔ اور ہاں جب دشمن سپر ڈال دے تو مسلمان بھی جنگ سے ہاتھ اٹھالیں، قیدی ہاتھ آئیں، تو حسن مروت سے انہیں اسلام کی دعوت دیں وہ مان لیں تو بہتر ورنہ جبر نہ کریں کیونکہ تبدیلی مذہب میں مطلق جبر نہیں۔

غنیمت :-

اس لفظ کا مادہ غَنِمَ ہے یعنی اس نے حاصل کیا۔ غنیمت کے لغوی معنی ہیں حاصل کرنا۔

عرب میں اسلام سے پہلے حصول مال کا بڑا ذریعہ جنگ کی لوٹ تھی اس لئے اسے بھی غنیمت کہنے لگے۔

ایک خیال ہے کہ اس کا مادہ غَنَمْ ہے۔ عربوں کے سرمایہ کا بڑا حصہ بھیڑ بکریوں اور اونٹ وغیرہ چرندے تھے۔ قبیلوں کی جنگ میں فریق غالب کو مغلوب کا جو مال ہاتھ آتا۔ اس میں زیادہ تر بھیڑ بکریاں ہوتی تھیں۔ اس لئے جنگ میں ملے ہوئے مال کو غنیمت کہنے لگے۔ غنیمت میں مال و اسباب کے علاوہ اسیران جنگ بھی شامل تھے۔

اس کے قریب المعنی ایک لفظ فئے ہے۔ جو قرآن مجید میں بھی آیا ہے فئے اس مال کو کہتے ہیں جو کسی ملک یا قوم نے بغیر جنگ کے اسلامی ریاست یا اسلامی فوج کو

پیش کیا ہو۔
غنیمت کے لئے قرآن حکیم میں انفال کا لفظ بھی آیا ہے۔
غنیمت کی پہلی شرط یہ ہے۔ کہ نہتے قافلے پر حملہ نہ کیا جائے۔ صرف مدافعتی جنگ میں غنیمت کی اجازت ہے۔ اور وہ بھی اس صورت میں کہ جنگ خوب زور شور سے چھڑ چکی ہو۔ اس میں چونکہ مسلمانوں کا جانی اور مالی نقصان ہوتا ہے۔ اس لئے تلافی کے لئے غنیمت مباح اور حلال ہے۔ موجودہ عہد میں بھی مغلوب فریق سے تاوان جنگ وصول کیا جاتا ہے۔ غنیمت بھی درحقیقت تاوان جنگ ہی کا ایک نام ہے۔ یاد رہے کہ اس کے لئے یہ شرط نہایت ضروری ہے کہ جنگ میں پہل دشمن کی طرف سے ہو۔
شروع شروع میں اسلامی فوج کی تنخواہیں مقرر نہ تھیں انھیں مال غنیمت ہی سے حصہ ملتا تھا۔ غنیمت کا سب مال ایک جگہ جمع ہوتا تھا پانچواں حصہ الگ ہو کر بیت المال (قومی خزانے) میں جاتا تھا اور چار حصے مجاہدین پر تقسیم کئے جاتے تھے۔ جو حصہ بیت المال میں جاتا تھا اس کے پانچ مصرف بتائے گئے ہیں۔
(۱) اللہ کے لئے۔ (۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے
(۳) ذوی القربیٰ کے لئے (۴) مسکینوں کے لئے۔
(۵) مسافروں کے لئے۔
اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حصے کا روپیہ رفاہ عامہ کے کاموں پر خرچ ہوتا تھا حضورؐ کا ارشاد ہے۔
مَالِیْ اِلَّا الْخُمُسُ وَالْخُمُسُ مَرْدُوْدٌ لَکُمْ۔ میرے لئے پانچواں حصہ ہے اور وہ بھی تمہیں واپس مل جاتا ہے۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی گواہ ہے کہ آپؐ نے غنیمت کو کبھی وسیلہ تعیش نہیں بنایا۔
آپؐ کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ مہینوں گھر میں چولہا نہیں جلتا تھا۔ روکھی سوکھی کھا کر گذر اوقات کر لیتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد ہے ہم کو

کھانا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہی نصیب ہوا۔
ذوی القربیٰ (رشتہ دار) سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار ہیں انہوں نے شروع ہی سے آپؐ کی حفاظت اور نگہداشت میں عظیم مالی قربانیاں دی تھیں۔ اس کے علاوہ آپؐ کی آل پر زکوٰۃ اور صدقات کا روپیہ بھی حرام ہے۔ اس لئے اس حصہ سے ان کے مالی خسارے کی تلافی کی جاتی تھی۔
(حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپؐ سے رشتہ داروں کا حصہ جاتا رہا ان کے وظیفے مقرر ہو گئے۔)
مساکین سے مُراد وہ لوگ ہیں جو معذور ہوں اور محنت، مشقت سے عاجز ہوں۔
ابن سبیل مُسافر کو کہتے ہیں مساکین کی مدد اور مسافر کی سہولتوں پر جو روپیہ صرف ہوتا تھا اس کا ایک سرچشمہ خمس بھی تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں نہ کوئی خزانہ تھا اور نہ حساب کتاب کا دفتر غنیمت کا مال مسجد نبوی کے صحن میں ڈھیر کر دیا جاتا تھا اور وہیں بالعموم پہلے ہی دن لوگوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔
جنگ میں قیدی بنانے کا رواج آج بھی ہے۔ فرق یہ ہے کہ اسلام میں قیدیوں سے شفقت اور انسانیت کا سلوک کرنے کی بہت تاکید ہے۔ جیسا کہ جنگ بدر کے واقعات سے ظاہر ہے۔ ان کے سامنے اخلاق کا عمدہ نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ اسلام کی طرف مائل ہوں۔ انہیں قتل کرنے کی اجازت نہیں (قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالےٰ ہے۔ کہ یا تو انہیں احسان کر کے بغیر رقم یا عوضانہ یا فدیہ کے چھوڑ دیا جائے یا زرِ فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے قتل کی ہرگز اجازت نہیں۔
اگر ان کا فدیہ دینے والا کوئی نہ ہو اور انہیں غلامی میں رکھا جائے تو ان کے ساتھ برادرانہ اور مساویانہ سلوک کیا جائے۔ غلام کو اختیار ہے کہ کسی وقت بھی اپنی قیمت دیکر غلامی سے آزاد ہو جائے اگر اس کا مالک اس پر ظلم کرے اور حاکم عدالت کو اس کا ثبوت مل جائے تو وہ اس کی آزادی کا حکم دے سکتا ہے لوگ غلامی پر اعتراض کرتے ہوئے لفظ غلام کو اپنی لغت کے اعتبار سے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ اسلامی

مفہوم کے اعتبار سے غلام کی حیثیت بھائی کی سی ہے۔
یہاں تک کہ بعض صورتوں میں وہ اپنے مالک کا وارث بھی ہوتا ہے۔

اہم سوالات

۱۔ اسلام کے تصورات "امت" کی وضاحت کریں۔ اور نظریہ قومیت کے ساتھ اس کا مقابلہ کریں۔
۲۔ اُمت مسلمہ کے شعائر پر مضمون لکھیں اور ساتھ ہی بتائیں کہ تصور اُمت کو مضبوط کرنے کے لئے کون کون سے امور ضروری ہیں اور کیوں؟
۳۔ اخوتِ اسلامی کی اہمیت پر بحث کریں۔ اور اس کے حقوق کی وضاحت کریں۔
۴۔ تبلیغ سے کیا مُراد ہے۔ اس کی ضرورت کیوں ہے۔ نیز طریقہ تبلیغ کی تشریح کریں۔
۵۔ اسلام میں جہاد سے کیا مُراد ہے اس کی اہمیت کس بنا پر ہے۔ اس کے فوائد اور مصالح پر نوٹ لکھیں۔

آخری گذارش

تہذیب اسلامی و نظام حیات اسلامی سے متعلق آپ کی خدمت میں ناچیز اور ناکام کوشش جو گذشتہ صفحات میں آپ نے ملاحظہ فرمائی ہے پیش خدمت ہے اس کے ساتھ ہی ایک دو ایسے ضروری امور ہیں جو حرف آخر کے طور پر اور اس تمام پیش کش کے نتائج کے طور پر تحریر کئے جانے ضروری ہیں۔

تہذیب اسلامی کا پاکستان کے نظریہ سے تعلّق

(۱) اسلام اور پاکستان کوئی دو چیزیں نہیں۔ اسلام کے اصولوں اور عقیدے کی بنا پر ہی پاکستان کی بُنیاد رکھی گئی ہے۔ اس لئے پاکستان سے وفاداری دراصل اسلام کے ساتھ وفا اور مروت کا عہد باندھنا ہے اور اس سلسلہ میں یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ موجودہ پاکستان کے زعما اور بڑے لوگوں میں نظریہ پاکستان بہت کم اصحاب کے پیش نظر ہے۔ یعنی مُسلمان تو رہے ایک طرف پاکستان میں جو غیر مُسلم آباد ہیں ان کو بھی پاکستان کے نظریے سے پورا اتفاق ہونا ضروری ہے۔ ورنہ سیاسی طور پر یہ لوگ پاکستان کے غدار ثابت ہوں گے۔

دورِ غلامی کے ثمرات۔

دوسری بات یہ ہے کہ پاکستان ڈیڑھ دو سو سال غلام رہنے کے بعد اس وقت آزاد ہوا جب کہ یہاں کے باشندوں کے اندر اسلامی نظریوں اور ملی اقدار کو ایک خاص ناپاک منصوبہ کے ماتحت ختم کر کے رکھ دیا گیا اور اس طرح اس نوآزاد ملک کے اندر ایسے ایسے نظریے جنم لینے لگے جن کا اسلام اور تعلیمات اسلام سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا اس لئے یہاں جب ملی اور اسلامی شعور ہی بیدار نہیں ہے تو یہ کس طرح توقع کی جاسکتی ہے کہ پاکستانی یا قومی شعور بیدار ہوگا۔ اس لئے ضروری یہ ہے کہ ڈیڑھ سو سالہ غلامی کے اثرات پہلے قوم کے ذہن سے دور کئے جائیں پھر جب ذہن صاف ہوگا تو اس وقت درست اسلامی نظریے اور ملی اقدار کے لئے ذہن تیار ہوگا اور اس قبولیت کے نتائج ملت اسلامیہ کے لئے فائدہ مند ہوں گے۔ دیگر نہ اسی طرح تہذیب اسلامی اور نظریہ حیات اسلامی کے اسباق ایک غیر مربوط

خیال اور نظریے کی کڑی معلوم ہو گی۔ جس کا باقی تعلیمی پروگرام سے کچھ تعلق نہ ہوگا۔
اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی تاریخ و ثقافت کے تمام ذرائع اور مآخذ
کو خالص اسلامی بنائیں اور صرف ان مورخوں اور مصنفوں کی کتابیں اپنے پیشِ نظر
رکھیں جن کا تعلق اپنی شاندار ماضی سے قائم ہے۔ اور اس سلسلہ میں تمام واقعات
اور نظریات کو غیر اسلامی مآخذ اور متعصب دانشوروں کی دست بُرد سے محفوظ
رکھیں۔ جو اپنی تمام زندگی اسی کوشش میں رہے ہیں اور جن کی زندگی کا یہی ایک
مقصد ہے کہ مسلمانوں کو ان کے اسلاف سے کاٹ دیا جائے اور ان کے ماضی کو داغدار
بنایا جائے، اور کہا جائے کہ پاکستان کے عوام اور اہلِ اسلام کا بھلا اس میں ہے کہ
انہیں ملحدانہ اور مادہ پرستانہ نظریوں کے ماتحت جدید تعلیم حاصل کرنی چاہئے۔
ان صفحات میں زیادہ گنجائش نہیں صرف اشارے ہی کافی ہیں کسی اور جگہ
انشاء اللہ زیادہ وضاحت سے عرض کروں گا۔

وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغ

محمد عبد الغنی۔ خلف۔ حافظ محمد امین رحمۃ اللہ علیہ